طباعت : زیر نگرانی جناب جلال الدین اکبر

"اردو کمپیوٹر سنٹر فون نمبر 4530850 سیلولر 9848022987

35/M/181-1-17 - روبرو جامعہ عائشہ نسوان

داراب جنگ کالونی - مادناپیٹ - حیدرآباد ۵۹ (اے-پی)

نہ سہم شبِ سیاہ سے ، ذرا دیکھ تو اُفق پر
ہے جہانِ نورِ پنہاں اِنہیں ظلمتوں کے آگے

عزیز حسین عزیز

صدائے کرب
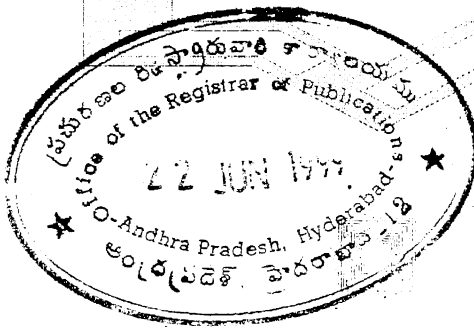
عزیز حسین عزیز

فالکن ہاؤز، 16-1-24/E/3A/3B

فرح کالونی، سعید آباد، حیدرآباد۔500059

(اے۔پی)۔انڈیا

فون (رہائش): 4531097

طبع : اوّل

سنہ اشاعت : ڈسمبر ۱۹۹۸ء

کتابت : الفلاح کمپیوٹرس، مادنا پیٹ، سعید آباد حیدر آباد۔ فون: 4413793

طباعت : او۔ ایس۔ گرافکس ، نارائن گوڑہ ، حیدر آباد

تعداد : ۵۰۰

سرورق : خطاط العصر عالیجناب محمد عبد السلام صاحب

تزئین و تشکیل : مصنف

قیمت : حیدر آباد -/Rs.100 (اضافہ پوسٹل چارجس دیگر شہروں کیلئے)

(سعودی عرب: -/SR 50)

ناشر : مکتبۂ شعر و حکمت، 6-3-659/2، کپاڈیہ لین، سوماجی گوڑہ، حیدر آباد۔

کتاب ملنے کے پتے

۱۔ مکتبۂ شعر و حکمت، 6-3-659/2، کپاڈیہ لین، سوماجی گوڑہ، حیدر آباد۔

۲۔ حسامی بک ڈپو، چار مینار، حیدر آباد۔

۳۔ سیلز کاؤنٹر روزنامہ سیاست، جواہر لال نہرو روڈ، حیدر آباد۔

۴۔ الکتاب پبلشرز، گن فاؤنڈری ، حیدر آباد۔

۵۔ حیدر آباد لٹریری فورم (حلف) 6-3-659/2، کپاڈیہ لین، سوماجی گوڑہ، حیدر آباد۔

۶۔ اسٹوڈنٹس بک ہاؤز، چار مینار، حیدر آباد۔

۷۔ اقبال اکیڈیمی، مدینہ منشن، نارائن گوڑہ، حیدر آباد۔

۸۔ سب رس کتاب گھر، سوماجی گوڑہ، حیدر آباد۔

۹۔ ادارہ شگوفہ، 31 بیچلرس کوارٹرس، معظم جاہی مارکیٹ، حیدر آباد۔

۱۰۔ انجمن ترقی اردو، اردو ہال، حمایت نگر، حیدر آباد۔

۱۱۔ بمکان مصنف۔ فالکن ہاؤز فرح کالونی، سعید آباد حیدر آباد۔ فون رہائش 4531097۔

۱۲۔ مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر، دہلی۔

۱۳۔ شب خون کتاب گھر، 313 رانی منڈی، الہ آباد 3۔

یہ مجموعہ کلام اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش حیدر آباد کی جُزوی اِعانت سے شائع کیا گیا۔

ترتیب

انتساب

کرب کی شکار قوم کے نام

جہاں میں نفرتوں کی ہر طرف یلغار ہے ساقی
محبت۔ اب یہاں رسوا سرِ بازار ہے ساقی

یہ دنیا کار گاہِ آفت و آزار ہے ساقی
سکونِ قلب کا ملنا یہاں دشوار ہے ساقی

مسرت سے چمک اٹھتی تھیں آنکھیں دیکھ کر جس کو
دلوں میں اب کہاں وہ جذبۂ ایثار ہے ساقی

یہاں دشمن تو ہے کچھ دور خِفّت سے، ندامت سے
مگر جو دوست ہے وہ برسرِ پیکار ہے ساقی

یہ بزمِ میکشی اپنی نہ یہ جام و سبو اپنے
تو میخواروں میں پھر کس بات کی تکرار ہے ساقی

رکاوٹ جس کی فطرت ہو اُسے رستہ نہیں کہتے
رہِ ہستی ہے یا اِک آہنی دیوار ہے ساقی

بوجہ کیف و مستی رقص میں ہیں بحر و بر لیکن
صدائے کرب لگتا ہے پسِ جھنکار ہے ساقی

بناوٹ کے اُصولوں میں دِکھاوے کی صداقت ہے
قلم کا زور ہے اور کاغذی سرکار ہے ساقی

ہزاروں مٹ گئے تعمیر کی حسرت لیئے دل میں
حقیقت میں یہ دنیا ریت کی دیوار ہے ساقی

عزیزِ بے کس و بے حال کا کوئی نہیں ہمدم
جہاں میں ایک تو ہی مونس و غمخوار ہے ساقی

تعارف

شہر میں لگتا نہیں ہے دل بیابانی ہوں میں
بس یہی کافی ہے میرے واسطے ، فانی ہوں میں
میرا قد کیوں دیکھتے ہو میں کوئی پربت نہیں
میری گہرائی کو دیکھو جھیل کا پانی ہوں میں

جو ہم میں تم میں ہے اُس رشتۂ باہم کو پہچانو — تمہارے چاہنے والے ہیں ہم بھی ، ہم کو پہچانو
سبب ہوگا کوئی آخر کسی کی کج نگاہی کا — کبھی تم بھی تو وجہِ نفرتِ پیہم کو پہچانو
مرے اشکوں کی کیا قیمت ہے اِسکا تجزیہ چھوڑو — گلوں کے حال پہ روتی ہوئی شبنم کو پہچانو
پرکھنا ہو اگر تم کو ہماری شخصیت پرکھو — عزیزو اس سے پہلے فطرتِ آدم کو پہچانو
ہماری شخصیت سے آپ واقف ہوگئے ، مانا — ہمارے درد کو جانو ہمارے غم کو پہچانو
تسلّی سے کسی کی غمگساری ہو نہیں سکتی — علاجِ غم سے پہلے نُسخۂ مرہم کو پہچانو
خوشی میں بے رُخی اچھی نہ غم میں بیدلی اچھی — اُصولِ انبساط و اقتضائے غم کو پہچانو
بڑی ٹھنڈک ہے مانا گیسوئے جاناں کے سائے میں — یہ سایہ خوب ہے پر اِس کے پیچ و خم کو پہچانو

عزیز احساس مرجائے تو پھر انسان مرجائے
اسی احساس سے انسان کے دم خم کو پہچانو

آپ بیتی

میری پیدائش ۱۴/اگست ۱۹۴۴ء کو شہر حیدر آباد کے ایک متوسط گھرانے میں ہوئی۔ اُردو میڈیم سے میٹرک کامیاب کرنے کے بعد کاروبار میں والد محترم صوفی احمد حسین صدیقیؒ قادری الملتانی (موظف الکٹریشن، دواخانہ عثمانیہ) کا ہاتھ بٹانے میں سرکاری ملازمت کے حصول کی معیادِ عمر گذر گئی۔ والد محترم واجداد سلسلہ قادری الملتانی سے وابستہ تھے۔ داداپیر حضرت سید غلام علی شاہ صاحب قبلہؒ عالم تبحر صوفی وفقیر منش تھے۔ (ہم نے اپنی آنکھ اسی پر نور ماحول میں کھولی اور علم حق و تصوف کی سیر حاصل گفتگو اُٹھتے بیٹھتے و کھیلتے کودتے ہمارے سینوں میں آپ ہی اترتی چلی گئی)۔

۱۹۶۷ء میں شادی ہوئی۔ بعد ازاں نائٹ کالج سے بی۔ کام مکمل کیا۔ ٹائپ، شارٹ ہینڈ کی تکمیل کی۔ Aptech سے کمپیوٹر کی .P.G.D.C.A ڈگری برائے (System Analyst) حاصل کی۔ ۱۹۷۶ء اگست میں جدہ، سعودی عرب روانہ ہوا جہاں ایک جاپانی کمپنی .KOMATSU LTD میں بہ حیثیت (.Secratary To G.M.(M.E) ۱۹۷۶ء اگست ہی سے ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۷۸ء میں فیملی (بیوی ولڑکی) کو سعودی عرب بلوالیا۔ وہاں تین لڑکے اور ایک لڑکی تولد ہوئے۔ اُنکی تعلیم کا کچھ حصہ وہیں پر گذرا۔ ایک سنہری دور سے مستفید ہونے کے بعد کچھ ناگزیر وجوہات کی بناء ۱۹۸۶ء میں واپس انڈیا آگیا۔ ۱۹۹۳ء اور ۱۹۹۶ء میں دوبار قلیل مدت کیلئے جدہ سعودی عرب ملازمت کیلئے جاچکا ہوں۔ لیکن بغیر اہل وعیال کے وہاں جی نہ لگا۔ اور اب وہاں وہ پہلی سی رعنائی بھی باقی نہ رہی۔ سعودی عرب سے واپسی پر ذاتی کاروبار بھی کیا لیکن چند وجوہات کی بناء اس باب کو بھی بند کردینا پڑا۔ کیونکہ کاروبار میں اندیشے بہت ہیں۔ اور اتفاق سے "مرے بچے ابھی چھوٹے بہت ہیں"۔ تنہا آدمی کاروبار کی دیکھ بھال خاطر خواہ پیمانے پر نہیں کرسکتا۔ ویسے اللہ مسبب الاسباب ہے، خیر سے گذر رہی ہے۔ قدیم دوست احباب سعودی عرب میں اپنے اپنے محور پر گھوم رہے ہیں۔ جن میں سے بیشتر راہی وطن ہوچکے ہیں۔ ۱۹۸۶ سے وہاں گردش لیل ونہار اتنی تیز گام ہے کہ کسی کو کسی کی سدھ ہی نہیں رہی۔ ویسے بھی "وہ دن ہوا ہوئے کہ پسینہ گلاب تھا"۔ اب حیدر آباد میں مُستقلاً قیام پذیر ہوں۔

میرا شعری سفر: کم سنی سے شعر گوئی کا شغف رہا۔ (۱۹۵۹ء تا ۱۹۶۴ء) آصفجاہی لائبریری، افضل گنج میں روزآنہ ۵ تا ۷ ساعت شام جاتا اور مختلف موضوعاتی کتب بینی میں مشغول رہتا۔ اُن میں ناول، افسانے، تاریخی، اسلامی، مذہبی، سماجی وادبی کتب زیر مطالعہ رہے۔ ۱۹۶۵ء سے شعر کہنے شروع کیئے۔ اکثر غزلیں روزنامہ رہنمائے دکن میں شائع ہوئیں۔ اُس وقت معزز شاعر جناب خواجہ شوق صاحب، رئیس شعبۂ ادب تھے۔ اُنکی حوصلہ افزائی اور مخصوص ہدایت نے رہبری فرمائی۔ کچھ دن مرحوم جناب حلمی آفندی صاحب سے بھی رموز شاعری سے واقفیت حاصل کی۔ لیکن باضابطہ میں نے کسی کے آگے

زانوئے ادب طے نہیں کیا۔ میں نے غزل و نظم ہر دو صنف میں طبع آزمائی کی۔

سعودی عرب میں محترم مصلح الدین سعدی صاحب و محترم رؤف خلش صاحب کی آمد کے بعد وہاں مشاعروں و جلسوں کا خوبصورت سلسلہ شروع ہوا۔ و نیز ان ہر دو صاحبین و نیز محترم عبداللہ ناظر صاحب و جناب اعتماد صدیقی، بے کس نواز شارق کی حوصلہ افزائی نے مجھ میں تحریک پیدا کی۔ ادبی انجمن "حلقہ ارباب ذوق" جدہ سے مختلف عہدوں پر وابستگی رہی۔ خصوصاً جناب اعتماد صدیقی و بیکس نواز شارق کے ساتھ جناب مصلح الدین سعدی صاحب، رؤف خلش صاحب اور طارق غازی صاحب (مینجنگ ایڈیٹر، سعودی گزٹ، جدہ) کی سرپرستی میں ہندوپاک کے نامور شعراء کے ساتھ کامیاب مشاعروں کا انعقاد عمل میں آیا۔

۱۹۶۵ء تا ۱۹۷۵ء کا عرصہ شاعری کا ابتدائی دور تھا جس میں صرف لب و رخسار، گل و گلزار و باغ و بہار کی عکاسی تھی۔ بعد میں بدلتے ہوئے حالات و تجربات کی بناء طبیعت میں عجیب انقلاب پیدا ہوا، اور قلم خود بخود حسن و ظرافت کی چاشنی کے بجائے طنزیہ لہجہ اختیار کر گیا۔

ہم کہ تن آساں تھے پر ائے گردشِ لیل و نہار
جستجو کی دوڑ میں دار و رسن تک آگئے

لہٰذا اس دہے کی رنگین شاعری کو میں نے خود ہی نوکری کی نذر کر دیا۔

اس مجموعے کلام میں جو نظمیں اور غزلیں ہیں وہ ۱۹۷۶ء سے ۱۹۹۸ء تک آپ بیتی و جگ بیتی کا احاطہ کرتی ہیں۔

اس خصوص میں ارباب مجاز سے ایک درخواست بھی ہے وہ یہ کہ ملک کے موجودہ سیاسی پس منظر میں کہی ہوئی میری نظموں یا غزلوں کو میری غداری، وطن دشمنی یا تعصب کا اظہار نہ سمجھیں بلکہ یہ ایک تلخ حقیقت پر مبنی جذبات کا اظہار ہے، جن کا تدارک ہونا از حد ضروری ہے۔

میں نے کبھی کسی سے فکر یا الفاظ نہیں چرائے۔ قدرت نے یہ صلاحیت مجھ میں بدرجہ اتم موجود رکھی ہے۔ زود گو ہوں۔ لیکن میرے کلام کا بیشتر حصہ یا تو میں نے خود ہی ضائع کر دیا یا سفر میں وہ خود ہی ضائع ہو گیا۔ جو کچھ بھی تخلیقات میرے اپنے انتخاب میں آئیں۔ وہ اس "صدائے کرب" کی شکل میں پیشِ خدمت ہیں۔

عزیز حسین عزیز

۱۴/اگست ۱۹۹۸ء

چھوڑیئے بھی اہلِ دل ، اہلِ نظر کا تذکرہ
شام کو اچھا نہیں لگتا سحر کا تذکرہ

آج بھی عزّت ہے، وُقعت ہے سخن پرداز کی
کس نگر کی بات ہے یہ کس نگر کا تذکرہ

ذِکر اوروں کا نہیں ہے ، غیر کا قِصّہ نہیں
بات اپنے گھر کی ہے یہ اپنے گھر کا تذکرہ

بے ہُنر کی ہونہاری پر تعجب کیوں نہ ہو
کس ہُنر مندی سے کرتا ہے ہُنر کا تذکرہ

جس سفر نے فرقتوں کے داغ اِس دل کو دیئے
چھیڑیئے نہ میرے آگے اُس سفر کا تذکرہ

رات ساری گھر کی یادوں کو بُھلانے میں کٹی
صبحدم چڑیوں نے پھر چھیڑا ہے گھر کا تذکرہ

میں تمھیں آخر سناؤں تو سناؤں کس طرح
خشک لب ہیں اور اُن پر چشمِ تر کا تذکرہ

دوڑتی پھرتی ہیں لاشیں زندگی کی آس میں
پر کسی لب پر نہیں ہے اِس خبر کا تذکرہ

وہ صحیفہ ہے یہ خاموشی کہ جس میں اَے عزیزؔ
عمر بھر کی داستاں ہے عمر بھر کا تذکرہ

میرے حریف میرے اُستاد ہوگئے ہیں
جتنے سبق دیئے تھے سب یاد ہوگئے ہیں

دیتے تھے خون کل تک ، اب خون چوستے ہیں
کیوں باغباں ہمارے صیاد ہوگئے ہیں

چھوڑا ہے اُس نے لیکن پر باندھ کر ہمارے
دنیا سمجھ رہی ہے آزاد ہوگئے ہیں

بے خانماں نہ سمجھو کہ ہم قرار بن کے
ٹوٹے ہوئے دلوں میں آباد ہوگئے ہیں

خوابوں کی یہ عمارت یونہی نہیں کھڑی ہے
ارماں کئی سپردِ بُنیاد ہوگئے ہیں

تفصیل پوچھتے ہو مجھ سے مرے عدو کی ؟
اِک فرد تھا کبھی ، اب افراد ہوگئے ہیں !

اک عمر کی کمائی دیمک نے چاٹ کھائی
دیکھو تو پُرزہ پُرزہ اَستاد ہوگئے ہیں

مُنصف بھی ہیں پُرانے ، قانون بھی پُرانا
فتنے ہیں کہ ہزاروں ایجاد ہوگئے ہیں

سب کو عزیزؔ رکھنا ممکن نہیں جہاں میں
اس آرزو میں کتنے برباد ہوگئے ہیں

ادب میں جمود اور تعطل کا احساس

(ذاتی رائے)

میری دانست میں ادب میں جُمود اور تعطل کا احساس روایتی ادب اور ترقی پسند ادب کے حامی ادیب و شاعر کے اپنے اپنے کلام، مضامین و تصانیف کی ہیئت ترکیبی پر شدید اختلاف کا سبب ہے۔ حالانکہ کلاسیکی و تخلیقی توانائی دنیائے ادب کے ہر دو بر آعظم میں بدرجۂ اُتم موجود ہے۔ دونوں طریق ادب کے پرستار اس کی اہمیت و افادیت کو بخوبی محسوس کرتے ہیں۔ لیکن ایک دوسرے کی تخلیقات پر تنقید و تبصرے کیلئے حدودِ ادب سے باہر نکل کر، نیوکلیر توانائی کی مانند ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے آرہے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہ گنگا جمنی سنگم نیرنگئ آبِ رواں کی بقاء کی بجائے سرکش موجوں کی طرح فنا فی الآب کا شکار ہو چکا ہے۔ سوچنے و غور و فکر کرنے کیلئے اب صرف یہی بات باقی رہ جاتی ہے کہ یہ طریق خودسری ہر دو طرف کیوں اور کس لیئے ہے۔ سب اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس صدی کے نصف باب کے دوران مادری زبان (اردو) کئی ہچکولے کھا چکی ہے۔ ۱۹۵۰ء سے قبل فارسی زبان کا مدارس سے اخراج عمل میں آیا جس کی بناء علم و ادب کا ایک زرین خزانہ ۱۹۴۰ء کے دہے میں عالم وجود میں آنے والی نسل کے ہاتھ نہ لگ سکا اور وہ زبان فارسی و عربی ہر دو کے علم سے محروم ہو گئے۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء کے دوران جو نسل وجود میں آئی وہ بتدریج اردو میڈیم سے دور ہوتی چلی گئی جس کی ذمہ داری خود اولیائے طلباء پر عائد ہوتی ہے کہ ہم ہی نے انگریزی میڈیم کو ترجیح دی اور بدلتے ہوئے زمانہ کے لحاظ سے اپنے بچوں کو مذہبی، ثقافتی، تہذیبی اقدار سے قطعی نابلد کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔ بتدریج اُردو میڈیم یکسر نظر انداز کر دیا گیا جس کے نتیجے میں آج ہمارے بچے نہ صرف اردو زبان سے ناواقف ہیں بلکہ شعر و ادب کو طنزیہ نظر سے دیکھتے ہوئے اپنی ہی تہذیب کی دھجیاں اُڑانے میں مصروف ہیں۔ ہماری اس نادانی کی وجہ سے ہمارے معاشرے میں اخلاقیات اور اپنی پرانی تہذیب کے سبھی آثار نئی تہذیب کے اندھیرے میں مدغم ہو گئے۔ آج ہم میں کتنے ایسے اولیائے طلباء ہیں جن کو اپنی اس فاش غلطی کا احساس و اعتراف ہے؟ بے شک ہم بھی اپنی اولاد کے ساتھ نئی تہذیب کی رو میں بہہ کر ماضی کی آنکھ سے بہت دور ہو چکے ہیں۔ ہم میں سے تقریباً ۸۰ فی صد طبقہ خود اپنی ہی تہذیب و اقدار کو حقارت سے دیکھتے ہوئے نئی نسل کو نئے ماحول میں پروان چڑھنے کا کھلا موقع دے رہا ہے۔

یہ بات نہایت خوش آئند ہے کہ اب مختلف گوشوں سے رضاکارانہ طور پر ذی حیثیت اور ذی ہوش اداروں کی جانب سے از سر نو اُردو کی تبلیغ و ترویج و تعلیم کے آغاز کیلئے نہایت سرعت سے اقدامات کئے جا رہے ہیں۔ بیشک یہ ایک فالِ نیک ہے۔ اِس طرح کم از کم نئی نسل کو پھر اپنی تہذیبی دھارے میں شامل کرنے کی اُمید پیدا ہو گئی ہے۔

اسکے علاوہ شاعروں، ادیبوں اور مختلف ادبی انجمنوں کے آپسی خلفشار کے سبب اُردو ادب کی زلف پریشاں بروقت سنواری نہ جا سکی۔ اسکے بجائے ہم ایک دوسرے کے دامن اَنا کو تار تار کرنے میں ایں دم تک برسرِ پیکار ہیں۔ کیا یہ بے جا ولغوی تعصب اُردو زبان و ادب کی صحیح و جامع تبلیغ و ترویج کی کاوشوں میں رکاوٹ کا سبب نہیں بنا؟!

سب سے بڑا المیہ یہ ہیکہ نوجوان شاعروں و ادیبوں کو پروان چڑھانے کیلئے اُن کی حوصلہ افزائی کرنے کی بجائے ہر دو میدان کے شہسوار اُن پر کسی عقاب کی طرح جھپٹ پڑتے ہیں (جیسا کہ وہ کبھی اِس دور سے گذرے ہی نہیں!؟) نتیجتاً کیوں کہ ابتدائی مراحل میں ویسے بھی احساس کم علمی و ناتجربہ کاری کے شکار رہتے ہیں، بجائے اپنے قلم میں سیاہی بھرنے کے اُس کو توڑ کر اس اذیت سے فرار حاصل کرنے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں۔

اس منظر سے ہٹ کر ہم اپنی نظر آج کل بپا ہو رہے ہر روز کئی مشاعروں کی طرف مرکوز کرتے ہیں۔ آج کل شعراء ''اور بھی غم ہیں زمانے میں شاعری کے سوا'' کے قول کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مختلف مقامات پر کبوتروں کی طرح اُڑتے ہوئے ایک ہی دن میں بیشمار مشاعروں میں اپنا کلام پڑھتے نظر آتے ہیں۔ کیا اس سے اُردو ادب کو معراج نصیب ہوئی یا رُسوائی!؟ موزوں وغیر موزوں، اہل و نااہل شعراء میں رسالوں و روزناموں میں متواتر اپنی اہم و غیر اہم تخلیقات کی اشاعت کا جنون بھی اس بات کا غماز ہے کہ ان میں پہچانے جانے کا جذبہ کس حد تک بڑھ چکا ہے! چاہے ادبی ستونوں کی نظر میں وہ پورے اُترتے ہوں یا نہیں؟۔ کیا یہ مکروہ وخلاف آداب نہیں!؟ اس طرح ایسے شعراء شاعری کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا کر زندگی کے دیگر اہم اُمور کی پابجائی سے علانیہ پہلوتہی کرنے میں رمق برابر بھی نہیں ہچکچاتے۔

تعجب اس بات کا بھی ہوتا ہے کہ وہ شاعر جو ایک منظوم کلام کا فطری خالق ہوتا ہے، کیوں اُس کی ذاتی زندگی لااُبالی ولا پرواہی کی شکار رہتی ہے۔ وہ جو خود کہتا ہے کیوں اُس پر عمل پیرا نہیں ہوتا؟ میرؔ و غالبؔ وغیرہ کے زمانے اور تھے، اُن کے کرب اور اُس دور کی اذیتوں کا ہمیں صحیح اندازہ تک نہیں۔ وہ اُردو شاعری کے ایسے عظیم سُتون تھے کہ ہم دس پیڑھی تک اُن کی ذات سے متعلق کتاب کا ایک ورق تک نہیں اُلٹ سکتے۔ حالیؔ واقبالؔ نے ہمیں جھنجھوڑ کر بیدار کرنے میں اپنے آپ کو وقف کر دیا اور ایک نیا انقلاب ہم میں اُجاگر ہوا۔ اساتذہ شعراء نے اپنے کلام میں ہر شعبۂ حیات پر جامع اظہارِ خیال کرتے ہوئے ہماری ذہنی صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ اور ہم ہیں کہ ایک دوسرے کو بونے سمجھ کر ٹیلوں سے اُتارنے کی شاعری میں مشغول ہیں حالانکہ ان میں بیشتر شعراء نے اپنی ذاتی کاوشوں سے اپنی پہچان آپ بناتے ہوئے اپنے فن کو پروان چڑھانے میں سرگرداں ہیں۔ لیکن اکثر و بیشتر شعراء ایک دوسرے کو حقارت اور رشک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ بے شک یہ

طریق بے نیازی قابلِ مذمت ہے۔ اور صریحاً یہ سَرد مہری، خشک رویّہ، اور رشک و حسد خود ایسے شعراء کی تنگ نظری اور خود سری کا ثبوت مُہیا کرتا ہے۔

یہاں اس بات کا خلاصہ بھی بے محل نہ ہوگا کہ مذکورہ بالا تمام اعتراضات کے باوجود خصوصاً حیدرآباد و اضلاع کی بے شمار ادبی انجمنوں نے ایک عرصہ سے اپنی روایتی و تہذیبی اقدار کو نہ صرف برقرار رکھا ہے بلکہ پابندی سے کامیاب مشاعروں کو منعقد کرتی ہیں ونیز ادبی اجلاس میں مختلف اہم اُمور اور موضوعات پر مذاکرہ و مباحثہ بھی ہوتا ہے۔ لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ حیدرآباد کی میزبانی کے فریفتہ وہ بیرونی (شمالی ہند اور پاکستان کے) شعراء حیدرآباد کے مایہ ناز شاعروں کو اسی خلوص سے وہاں مدعو کیوں نہیں کرتے؟!

ایک اور بات بُری طرح کھٹک رہی ہے کہ مشاعروں کا انعقاد بھی عالمی سطح پر کچھ کاروباری ذہنیت کے حامل غیر ادبی اصحاب کا پیشہ بن چکا ہے جن کی نظر صرف اُن مشاعروں سے حاصل ہونے والی آمدنی پر ہوتی ہے۔ مصلحتاً اگر یہ لازم و ملزوم ہی قرار پاتا ہے تو کم از کم اس ذریعہ سے حاصل شدہ آمدنی کا کچھ حصہ مستحق شاعروں و ادیبوں کی خدمات کی ستائش و پذیرائی کیلئے وقف کر دینا چاہئیے۔

ارضِ دکن نے بے شمار نامور شاعروں و ادیبوں کو دنیا میں روشناس کروایا ہے لیکن اُن میں سے بیشتر عالمی سطح تو کُجا ہنوز خود اپنے ہی مُلک کے حُدود تک بھی اپنی رسائی و شناسائی نہیں کروا سکے۔ اس میں اُنکا قصور نہیں، بلکہ یہ بات تو اُن کی خودداری کی غمّاز ہے۔ یہ فریضہ تو مقامی و علاقائی ادبی انجمنوں کا ہے کہ وہ ملّی و عالمی سطح پر اپنے روابط وسیع کرتے ہوئے ایسے شاعروں و ادیبوں کا تعارف کروائیں اور اُنکے فن کی تبلیغ و اشاعت میں ممد و معاون ثابت ہوں۔

اکثر مشاعروں میں آجکل شعراء ہی سامعین ہیں۔ کیا بات ہے کہ سنجیدہ سخن شناس سامعین کیوں مشاعروں میں نظر نہیں آتے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اکثر صدر مشاعرہ و مہمانان خصوصی عادتاً دیر سے مشاعرہ گاہ پہنچنے میں ہی اپنی قد آوری کے پنہاں ہونے کے شبہات میں مبتلا رہتے ہیں۔ وقت کی پابندی کے علاوہ مذکورہ بالا اعتراضات سے پاک و خوشگوار ماحول میں مشاعروں کا انعقاد عمل میں لایا جائے تو سخن پرور سامعین بھی اپنے ذوق کی تسکین کیلئے شرکت کریں گے جن کا آج کل محفلوں میں فقدان ہے۔

عزیز حسین عزیز

۱۴/اگست ۱۹۹۸ء

ہر رُکاوٹ کو ہوا کا سَر پھرا جُھونکا کہیں
سامنے دیوار بھی آئے تو دروازہ کہیں

بات کو سُننے ، سمجھنے کے زمانے لَد گئے
اَب یہ عالم ہے تو کہیئے ہم کسی سے کیا کہیں

جب خموشی توڑنا چاہی تو دُنیا نے کہا
یہ گزارش ہے جواباً ، ہاں کہیں یا نا کہیں

تلخیاں شیریں کلامی کا اگر ہوں ماحصل
اُن کو اپنی خُوئے خُوش فہمی کا خمیازہ کہیں

اب کئی چہروں کا مالک بن گیا ہے آدمی !
کون سے چہرے کو اُس کی ذات کا چہرہ کہیں !؟

گو وجُود اِس کا نہیں رکھتا کوئی مصرف مگر
اپنے سائے کو بھی اپنے جسم کا حِصّہ کہیں

یوں تو ہم سب ایک ہی منزل کے راہی ہیں مگر
اپنی اپنی راہ پر کیوں گامزن ہیں کیا کہیں

بُجھتے شُعلوں کی جسارت اُڑ گئی بن کر دُھواں
اِن چٹختی لکڑیوں کو راکھ کا ملبہ کہیں

وہ رگِ جاں سے قریں ہے پر نظر سے دور تر
کوئی بتلائے کہ اِس کو کونسا رشتہ کہیں

ہر نُمائش میں چمکتی ہیں سبھی اشیاء عزیز
جو کسوٹی پر کھرا اُترے اُسے سونا کہیں

حمد

عطا کرتا ہے جب تو ہی تو اپنے دل سے کیا مانگوں
تو داتا ہے، تو دیتا ہے تو پھر محفل سے کیا مانگو

ترا ساون، تری کرنیں، تری مٹی، تری کھیتی
یہ فصلیں کیا مجھے دیں گی میں آب و گِل سے کیا مانگو

جو کچھ پایا تو کیا پایا، جو کچھ کھویا یا تو کیا کھویا
یہ عالم ہے تو پھر اس سعیٔ لاحاصل سے کیا مانگو

ہر اک رستہ پہیلی ہے، ہر اک منزل معمہ ہے
کسی رستے پہ کیا ڈھونڈوں، کسی منزل سے کیا مانگو

کسی ساگر کی طرح تو سدا بیدار رہتا ہے
مرا مانجھی[1] ہے غفلت میں تو اس غافل سے کیا مانگو

لہو کا آخری قطرہ بھی پی کر جو پیاسا ہے
میں اپنی آخری خواہش میں اُس قاتل[2] سے کیا مانگو

میں حق کے واسطے سارا اثاثہ دے کے بیٹھا ہوں
کوئی اب یہ کہے اس حال میں باطل سے کیا مانگو

الٰہی دین و دنیا میں ہمیں تو سرخرو کر دے
یہی اک آرزوئے دل ہے تو پھر دل سے کیا مانگو

مرا مطلوب تو ہے، پھر طلب کی کیا ضرورت ہے
سمندر مل گیا مجھ کو لبِ ساحل سے کیا مانگو

ظہور آفتابِ کل[3] سے روشن ہے جہاں سارا
عزیز اس روزِ روشن میں مہِ کامل[4] سے کیا مانگوں

۱۔ مانجھی = ضمیر ۲۔ قاتل = ابلیس
۳۔ آفتابِ کل ۔ ذاتِ باری تعالےٰ ۴۔ مہِ کامل = دنیائے دوں

حمد

روشنی آپ ہیں دیا ہوں میں
آپ کے دم سے جل رہا ہوں میں

میں کسی کا نہیں ہوں دنیا میں
آپ کا صرف آپ کا ہوں میں

آئینہ رکھ کے روبرو اپنے
آپکا حُسن دیکھتا ہوں میں

آپ ہیں بحر بے کنار مگر
ایک قطرہ ہوں اور کیا ہوں میں

یہ بہاریں ہیں آپ کے دم سے
میرا کیا ہے کہ اِک ہوا ہوں میں

میری ہستی ہے آپ کی خاطر
آپ منزل ہیں ، راستہ ہوں میں

سارا قصہ ہے آپ کا قصہ
ابتداء ہوں نہ انتہا ہوں میں

بے خبر ہی سہی سمندر سے
ناؤ کا اپنی ناخدا ہوں میں

صبح آئی عزیزؔ گل کرنے
شب کو محفل میں جل چکا ہوں

○

فقط یہ جوشِ رحمت ہے اُبلتا ہے جو صدیوں سے
اگر عرفان ہو تو چشمۂ زم زم کو پہچانو
محبت ہی کے دم سے ہے وجودِ ہستی آدم
ہے جس کے دم قدم سے دم میں دم اُس دم کو پہچانو

نعت شریف

اس کائنات میں ہیں جلوہ نما محمد
صلِ علیٰ محمد ، صلِ علیٰ محمد
شام و سحر ہیں کب سے نغمہ سرا محمد
صلِ علیٰ محمد ، صلِ علیٰ محمد

شمس و قمر میں پنہاں ہے نور آپ ہی کا
کعبہ ہے آپ ہی کا ، ہے طور آپ ہی کا
ہیں آپ ہی سراپا نورِ خدا محمد
صلِ علیٰ محمد ، صلِ علیٰ محمد

شمس الضحیٰ محمد ، بدر الدجیٰ محمد
خیر الوریٰ محمد ، نور الہدیٰ محمد
رمزِ خدا محمد ، وصفِ خدا محمد
صلِ علیٰ محمد ، صلِ علیٰ محمد

مکے کے سب بتوں کو توڑا ہے آپ ہی نے
کافر کے دل میں ایماں پھونکا ہے آپ ہی نے
اب تک پکارتا ہے غارِ حرا محمد
صلِ علیٰ محمد ، صلِ علیٰ محمد

ہے ان کے دم قدم سے ایمان کی حرارت
موقوف ہے انہیں پر اسلام کی عمارت
صدیقؓ و عمرؓ ، عثمانؓ ، شیرِ خدا ، محمد
صلِ علیٰ محمد ، صلِ علیٰ محمد

تھی انبیاء کے دل میں دیدارِ حق کی حسرت
حق کو مگر تھی چاہت دیدارِ مصطفیٰ کی
معراج کو یوں پہنچے عرشِ علیٰ محمد
صلِ علیٰ محمد ، صلِ علیٰ محمد

ذاتِ رسولِ اکرم تقریر میں نہ آئے
نعتِ رسولِ اکرم تحریر میں نہ آئے
یہ نعت ہوئی لیکن بے ساختہ محمد
صلِ علیٰ محمد ، صلِ علیٰ محمد

یثرب کی سرزمیں پر ہیں آپ کے کفِ پا
حیراں تھا چل کے جاؤں میں آستاں پہ کیسے
پلکوں پہ کھینچ لایا جذبہ مرا محمد
صلِ علیٰ محمد ، صلِ علیٰ محمد

وہ رمزِ عشق خود میں آقا کہاں سے لاؤں
الفاظ کی کمی ہے ، معنی کہاں سے لاؤں
اشکوں سے آج اپنا منہ دھولیا محمد
صلِ علیٰ محمد ، صلِ علیٰ محمد

میں خوش نصیب ہوں کہ طیبہ کو آچکا ہوں
آقا کے آستاں پر پلکیں بچھا چکا ہوں
پھر بھی ہوں حاضری کا مشتاق یا محمد
صلِ علیٰ محمد ، صلِ علیٰ محمد

کافی ہے عاصیوں کو کوثر کا ایک قطرہ
سب منتظر رہیں گے محشر کے روز آقا
رکھنا عزیزؔ پر بھی چشمِ عطا محمد
صلِ علیٰ محمد ، صلِ علیٰ محمد

نعت شریف

دِیدۂ بینا اگر ہو وا دلِ بیدار کا
ذرہ ذرہ ہے تماشائی رُخِ انوار کا

لا اِلٰہ سے ہے الا اللہ تک حق کا بیاں
پھر اُسی کے ساتھ میں ہے تذکرہ سرکار کا

اَندھی آنکھوں میں وہ تابش اور وہ بینائی کہاں
حسنِ نورِ حق کہاں، اندھا کہاں دیدار کا!

ذہن ودل کو پاک تو کرلو ہر اک تکثیف سے
پھر ادب سے نام لینا سیدِ ابرار کا

ذاتِ احمدؐ ہی تو ہے یہ عِلم کا شہرِ بقا
اِک کشادہ در ہے اُس میں حیدرِ کرار کا

آپؐ کی سُنت کے آگے آئینہ کیا چیز ہے!
آپ حق کا آئینہ ہیں اور یہ دِیوار کا!

سوزنِ پرکار یوں تو ہے مدینے میں مگر
بیکراں ہے کس قدر یہ دائرہ پرکار کا!

بزمِ ہستی اُس چراغِ آرزو کا ہے سبب
اِک اُسی کے نور سے ہے سِلسِلہ انوار کا

وُسعت وحد، قامت وقد سے مُبرّا ہیں حضورؐ
کچھ اِحاطہ ہی نہیں ہے احمدِؐ مختار کا

ظاہر وباطن وہی ہیں اول وآخر وہی
اب کہو اُس نور سے کیا واسطہ تکرار کا

اُس کی بنیاد وبلندی کی نہیں ہے حد کوئی
اِس عِمارت ہی سے اندازہ ہوا معمار کا

فرشِ خاکی سے نبیؐ کا عرشِ اعظم کا سفر
اِک انوکھا معجزہ ہے وقت اور رفتار کا

لاکے سِدرۃ تک کہا معراج میں جبریل نے
اِس کے آگے آپؐ ہیں اور در ہے پردہ دار کا

قافلے ہیں راہِ عِصیاں میں بھٹکنے کیلئے
کام ہے بس راہ دِکھلانا اِسی مینار[1] کا

آپؐ ہی کے عشق میں پنہاں ہے لطفِ بندگی
آپؐ ہی کی اتباع میں ہے مزہ اقرار[2] کا

مجھ میں لاکھوں عیب ہیں اور تو ہے ستار العیوب
لاج رکھ لے اے خدا ہوں اُمتی سرکار کا

دربدر کیوں پھر رہا ہے فکرِ یزداں میں عزیزؔ
ایک ہی تو ہے وسیلہ احمدِؐ مختار کا

۱۔ مینار = سُنّتِ نبی کریمؐ ۲۔ اِقرار = کلمۂ طیبہ

نعتِ شریف

ہو مری زندگی مدینے میں یا نبی یا نبی مدینے میں
بن گئی زندگی کا سرمایہ جو گھڑی کٹ گئی مدینے میں
اُن کے روضے کو دیکھتے رہنا مشغلہ ہے یہی مدینے میں
جاں بہ لب تھے غموں سے ہم لیکن دل کو راحت ملی مدینے میں
سارے عالم میں نور ہے اُس کا وہ شمع جل اُٹھی مدینے میں
ہے جو مکہ میں نور کا عالم ہُو بہ ہُو ہے وہی مدینے میں
میں کہاں اور کہاں یہ در لیکن حیثیت بڑھ گئی مدینے میں
لَوٹ کر آگئے ہیں ہم آقا زندگی رہ گئی مدینے میں

سرفرازی عزیزؔ ہے اُس کی
جو جبیں جُھک گئی مدینے میں

ایک شعر

ذرا جی بھر کے اِس عالم کی پہلے سیر تو کرلو
اگر توفیق ہو پھر سرورِ عالم کو پہچانو

نذرانۂ عقیدت

(خُلفائے راشدین اور اولیاء اللہ کو)

نہ دِلداری سے ملتی ہے نہ ہُشیاری سے ملتی ہے
فتح یابی عمرؓ کی صوتِ یا ساریؔ سے ملتی ہے

وفاداری کسی کی ہی سہی آدم سے اِس دم تک
کہاں صدیقِؓ اکبر کی وفاداری سے ملتی ہے

جسے پاکیزگی کہتے ہیں کُنجی ہے وہ ایماں کی
وہ عثمانِ غنیؓ جیسی حیاداری سے ملتی ہے

شہادت ، فقر و فاقہ ، سادگی ، صبر و رضا کی داد
علیؓ ، آلِ علیؓ کو رحمتِ باری سے ملتی ہے

اگر بے شکل کوئی شئے ہو تو اچھی نہیں لگتی
ہر اِک صورت مُصوّر کی وضعداری سے ملتی ہے

فقیروں کی نِگاہیں تو اِسے دُھتکار دیتی ہیں
اِمیروں کو یہ دنیا زورِ سالاری سے ملتی ہے

قدم پہلے اُٹھا جس کا اُسی کو مِل گئی نعمت
یہ خیراتِ اِلٰہی بھی کہیں باری سے مِلتی ہے !

اسے بے فیض مت جانو کہ دنیا راہِ عُقبیٰ ہے
مگر یہ دولتِ بے حد تو بیداری سے ملتی ہے

اسے اِک خواب مت سمجھو کہ دوزخ اِک حقیقت ہے
کہ ہر نُوری کو یہ عبرت کسی ناری سے ملتی ہے

حقیر اِس کو نہ جانو کہ بلا ہے یہ قیامت کی
کہ شعلے کو توانائی بھی چنگاری سے ملتی ہے

جفاؤں سے نہیں ملتی یہ میراثِ جہانگیری
عزیز عِزّت و عظمت تو وفاداری سے ملتی ہے

(نذرانۂ عقیدت)

بارگاہ حسین ابنِ علیؓ میں

مِلا نے آنکھ پرستارِ شر سے جاتا ہے
وہ دینِ حق کا اَمیں کس اَثر سے جاتا ہے
وہ جس گھرانے سے تِشنہ لبوں کی پیاس بجھی
اُسی کی رسم نبھانے وہ گھر سے جاتا ہے
وہ جس کے خاکِ قدم میں تھا یہ جہانِ نعیم
وہ بے نیاز ہر اِک بام و در سے جاتا ہے
برائے نام بہتّر نفوس ساتھ لیئے
وہ کون ہے جو تری رہ گذر سے جاتا ہے
نہ سیم و زر کی تمنّا نہ آس دُنیا کی
یہ قافلہ تو بڑے کرّوفر سے جاتا ہے
وہ جس پہ ٹوٹ پڑے تھے صعوبتوں کے پہاڑ
عدو کے نرغے میں کس دل جگر سے جاتا ہے
وہ جس کے سر پہ تھا اِتمام گفتگو کا مدار
وہ سرفروش کہاں چشمِ تر سے جاتا ہے
رہِ جہاں کی طرف بڑھ سکا نہ جس کا قدم
خُدا کی راہ میں نیزے پہ سر سے جاتا ہے
ہوا نہ ختم مگر وقتِ شام سے پہلے
وہ کام جس کیلئے وہ سحر سے جاتا ہے
متاعِ لوح و قلم ہو وہ جس کی مٹھی میں
وہی تو شانِ فقیری میں سر سے جاتا ہے
وہ آفتاب[1] جو ڈوبا تو ماہتاب[2] عزیزؔ
پروں میں ابرِ کرم کے اِدھر سے جاتا ہے

۱۔ آفتاب = حضرت امام حسینؓ ۲۔ ماہتاب = حضرت امام زین العابدینؒ

رودادِ آدم

آدمی مشتِ خاک کا خاکہ
تن بدن ، روحِ پاک کا خاکہ
فکر و دانش ، وقار کی صورت
ذہن و دل ، آنکھ ، ناک کا خاکہ
ایک دریا ہے بند کوزے میں
سحر آگیں ہے چاک کا خاکہ
یہ تگ و تاز اِس کی فطرت ہے
آتش افروز خاک کا خاکہ
عشق کی آگ ، حسن کا دریا
آب و آتش و خاک کا خاکہ
روزِ اوّل تھا اُس کی آمد پر
محفلِ پُرتپاک کا خاکہ
کنتُ کنزاً و مخفیاً کا راز
وجدِ حق رقص خاک کا خاکہ
حکمتِ عزّ وجل کا اِک پیکر
قدرتِ ذات پاک کا خاکہ
بن گیا دھندلی راہوں سے
منزلِ تابناک کا خاکہ
جادۂ ذوق و شوق کا نقشہ
صورتِ اِنہماک کا خاکہ
بٹ گیا جانے کیوں قبیلوں میں
نسل در نسل ناک کا خاکہ
رفتہ رفتہ بکھر گیا آخر
باہمی اِشتراک کا خاکہ
خوانِ دُنیا پہ ٹوٹ کر گرنا
منظرِ کربناک کا خاکہ
ہوگیا داغ داغ لمحوں میں
اِس کی پوشاکِ پاک کا خاکہ
ہے یہ انجام ایک لغزش کا
دامنِ چاک چاک کا خاکہ
ڈھل گیا اِس کی آنکھ سے شائد
محشرِ ہولناک کا خاکہ

دیدنی ہے عزیزؔ تربت پر
رحلتِ دردناک کا خاکہ

تنقید پر تنقید

اے نقیبِ فکر و دانش ہوش کا پیکر تو بن
دِل دُکھانے سے ذرا پہلے مِرا دِلبر تو بن

معنیٰ و الفاظ کی بیساکھیوں کو توڑ کر
چھُو سکے جو فِکر کی پرواز کو وہ پَر تو بن

منزلِ فِکر و نظر کے راستے ہیں پُر خطر
میں مُسافر بن چکا ہوں تو مِرا رَہبر تو بن

دُور تک رستہ نظر آتا نہیں ہے دَشت میں
تجُھ کو دَعوےٰ ہے تو پہلے قائدِ لشکر تو بن

یُوں سرِ منبر مجھے گھائل تو کر سکتا ہے تو
ہَٹ مِرے رَستے سے پہلے مِیل کا پتّھر تو بن

تو حَلق پر چل تو سکتا ہے چھُری بن کر مگر
جو اُتر جائے مِرے سینے میں وہ خنجر تو بن

آئینوں پر سنگباری کی یہ خو اچھّی نہیں
شِیشہ گر کیا بن سکے گا تو بھلا ، آزر تو بن

حُسنِ فِطرت کھِل اُٹھا ہے آپ اپنی ذات سے
بَرق بن کر ٹُوٹنے والے کبھی مَنظر تو بن

اِس اَندھیری رات کو درکار ہے اِک ماہتاب
بن سکا نہ ماہِ کامل ، نا سہی ، اَختر تو بن

میں فرشتہ تو نہیں ہوں عیب سے عاری عزیزؔ
چھوڑ دے دَعویٰ خدائی کا تو پیغمبر تو بن

یہ شُعلہ ہے خُود اپنے ظَرف کی گرمی سے جلتا ہے
ہَوا جب رَقص کرتی ہے تو بے شَرمی سے جلتا ہے
چَراغوں کے کھُلے سَر پر ذرا فَانُوس تو رکھدو
یہی بَہکا ہوا شُعلہ بڑی نَرمی سے جلتا ہے

غزلیں

شاعری کی دُھن ہے طاری پھر وہی دیوانگی
فکر و فن کی شہسواری پھر وہی دیوانگی

پھر جنونِ یادِ یاری پھر وہی دیوانگی
پھر وہی تصویر پیاری پھر وہی دیوانگی

پھر لب و رخسار کی لالی نے چھیڑی ہے غزل
پھر وہی مستی کنواری پھر وہی دیوانگی

پھر خرد کو نیند آجانا ، جنوں کا جاگنا
پھر وہی وحشت ہے طاری پھر وہی دیوانگی

فاعلاتن ، فاعلاتن ، فاعلاتن ، فاعلن
لب پہ ہے جاری وساری پھر وہی دیوانگی

کورے کاغذ اور قلم کو پھر سجانا میز پر
پھر وہی کرسی ہماری پھر وہی دیوانگی

بیٹھے بیٹھے سیر کرنا عالمِ احساس کی
پھر وہی اختر شماری پھر وہی دیوانگی

پھر اُنہی رِستے ہوئے زخموں کے مرہم کی تلاش
پھر اُمید غمگساری پھر وہی دیوانگی

پھر اُسی بنجر زمیں پر ہل چلانا رات دن
پھر لہو کی آبیاری پھر وہی دیوانگی

حادثاتِ زندگی سے دل لگانا دِن تمام
جاگنا پھر رات ساری پھر وہی دیوانگی

میکدے کی سمت بڑھنا زندگی سے ہار کر
پھر وہی ناپائیداری پھر وہی دیوانگی

پھر طلوع ہونا فلک پر صبحدم خورشید کا
پھر اُمورِ خانہ داری پھر وہی دیوانگی

کچھ ملی ہے دادِ تحسیں سامعیں سے اے عزیزؔ
اور کچھ تنقید قاری پھر وہی دیوانگی

کب تک یہ کہو اپنی نِگاہوں سے گِروں میں
ہیرا ہوں، مہاجن کی تجوری میں رہوں میں؟

گِھس گِھس کے پرکھتا ہے کسوٹی پہ زمانہ
سونا ہوں تو کیوں سب کی نِگاہوں میں چبھوں میں؟

مِٹّی تو میری ذات ہے گھٹی میں پڑی ہے
پتّھر جو بنوں اب تو کہو کیسے بنوں میں؟

مِٹّی میں مِلوں تخم کی صورت تو نہیں غم
حسرت ہے کہ پھر شاخ پہ گُل بنکے کِھلوں میں!

ہاتھوں کی لکیروں کو خُدا میں نے کہا کب
منزل تو مقابل ہے جو دوگام چلوں میں!

بِگڑی ہوئی موجوں کا تقاضہ تو یہی ہے
ٹوٹی ہوئی کشتی لیئے دریا میں پھروں میں!

اِک آنکھ نہ بھائی یہ وفا اہلِ وفا کو
رکھتا ہوں اِسے دل میں بہ اندازِ جنوں میں!

وہ خط و کتابت کے زمانے تو گئے بیت
نظروں سے پڑھیں آپ جو آنکھوں سے کہوں میں

پِس جاؤں میں پتھر پہ خموشی سے، خوشی سے
پیسیں جو اُنہیں ہاتھوں میں پھر رنگ بھروں میں؟

کیا کچھ ترے قبضے میں نہیں قادرِ مطلق
سجدے میں گروں اور تہی ہاتھ اُٹھوں میں؟؟

اِتنا نہ گرادے کہ مِلے خاک میں عزّت
اِتنا نہ اُٹھا دے کہ سِتاروں پہ چلوں میں

سے دے کہ یہ آنسو ہی تو ہمدم ہیں عزیزؔ اب
آنکھوں میں جو آجائیں تو پلکوں سے چُنوں میں

میری روداد مرے عیب و ہُنر تک پڑھیئے
میں بہت کچھ ہوں مگر حرفِ بشر تک پڑھیئے

شب کی تنہائی میں زخموں کا صحیفہ لیکر
بھولی بسری ہوئی یادوں کو سحر تک پڑھیئے

ایک اِک حرف سے بہتی ہیں لہو کی ندیاں
بس تباہی ہی تباہی ہے جدھر تک پڑھیئے

صرف چہرے ہی کو پڑھتے ہو، غضب کرتے ہو
کیا بھروسہ ہے، زمانے کی نظر تک پڑھیئے

حال ہر موجِ پریشاں کا سمجھنے کیلیۓ
کشفِ ساحلِ سے کراماتِ بھنور تک پڑھیئے

قصر وایوان کے پرشکوہ حقائق ہیں مگر
ان حکایات کو آثارِ کھنڈر تک پڑھیئے

اپنے کہسار میں شاہیں کو پہنچنے کیلیۓ
زخم کتنے ہیں لگے پاؤں سے پر تک پڑھیئے

غور سے سُنئیے شبِ غم میں اذیت کا جرس
اُس کے ہر ذکر کو امکانِ گجر تک پڑھیئے

سانس کیا چیز ہے اِک رابطۂ موت و حیات
اک امانت ہے مگر حدِ نظر تک پڑھیئے

زیست اِک درسِ محبت ہے، عبادت ہے عزیزؔ
اس کو آغاز سے انجامِ سفر تک پڑھیئے

تو تو پتھر کا صنم ہے ، جانتا ہوں کیا کروں　　موم بن کر تو پگھل جائے تو میں پوجا کروں

تو مری آنکھوں کی اِن دو پتلیوں میں ہے تو کیا　　میرے آگے آئینہ رکھدے تو میں دیکھا کروں

آپ خود ہستی مری اندر ہی اندر بجھ گئی　　روشنی پھیلی ہوئی ہے شہر میں تو کیا کروں

تو کہ مجھ سے واسطہ رکھ کر بھی یوں انجان ہے　　اُس پہ پابندی ہے تیری راہ میں دیکھا کروں !

گو مرا دِل ایک چشمہ ہی سہی سوکھا ہوا　　جو سرِ مژگاں ہے اِک قطرہ اُسے دریا کروں ؟

میں کہ اک ذرّہ خدا یا اور یہ روزی یہ بتا　　تو مجھے پیدا کرے اور میں اسے پیدا کروں ؟

اپنے دامن کی تو کب کی اُڑ چکی ہیں دھجیاں　　اِک سلامت ہے گریباں بھی تو اُسکا کیا کروں !

جھیل کے پانی پہ رقصاں ہے شفق کی روشنی　　پھینک کر کنکر کوئی موجوں کو شرمندہ کروں ؟!

حوصلہ یہ تند موجوں میں بھی شاید ہو نہ ہو　　بلبلا ہو کر بھی میں طوفان سے کھیلا کروں !

یہ معمہ حل نہیں ہوتا ہے مجھ سے اَے عزیز

وہ تو میرے سامنے ہے ، یاد میں کیسا کروں !

میں ہوں وہ مُسافرِ وقت کہ جسے گھر نہ در کی تلاش ہے
مری منزلوں سے جو دُور ہو اُسی رہ گذر کی تلاش ہے

تری اِک جھلک کی اُمید پر جنہیں ہم نے دیکھا ہے عمر بھر
یہ نگاہِ شوقِ جمال کو اُنہیں بام و در کی تلاش ہے

جو چُھپا درونِ نقاب ہے ، وہ جمالِ زہرہ مثال کو
جسے ہے کمالِ مُشاہدہ ، اُسی دیدہ ور کی تلاش ہے

سرِ بامِ طائرِ حرص کے میں نے پر کتر کے تو رکھ دیئے
مجھے روکنے کی ہے آرزو ، اُسے بال و پر کی تلاش ہے

کڑی دوپہر کی وہ دُھوپ تھی ، میں کھڑا ہوا تھا شجر تلے
تو یہ باغبان کو شک ہوا کہ مجھے ثمر کی تلاش ہے

ہوا ٹکڑے ٹکڑے نصیب سے دلِ نامُراد کا آئینہ
اِسے پھر جو پہلی سی شکل دے اُسی شیشہ گر کی تلاش ہے

جو لکھا ہوا ہے کتاب میں ، وہ حِساب میرے نِصاب کا
وہی دِل شکستہ کلام ہی میری عُمر بھی کی تلاش ہے

وہ مُنافقوں کا تھا قافلہ ، اُنہیں کون حق پہ ہیں کیا پتہ
میں ہوں اُن کے گھر کی تلاش میں ، اُنہیں میرے سر کی تلاش ہے

یہاں بادشاہ فقیر ہیں ، ترے دَر کے آگے حقیر ہیں
ترا در نصیب سے مِل گیا یہی دَر بدر کی تلاش ہے

اے عزیزؔ بعد وِصال بھی ، رہے جن میں گرمئ زِندگی
بخدا زمانۂ حال کو ، اُنہی دِل ، جِگر کی تلاش ہے

زیست ہے ہر زحمتِ حد سے گذر جانے کا نام
موت کیا ہے، بس کسی حد پر ٹھہر جانے کا نام

اعترافِ لغزشِ پا کیا ہے ، ہم سے پوچھئے
صبح کے بھولے کا وقتِ شام گھر جانے کا نام

ایک ہی در کے تجسس میں نکلنا ہے سفر
ورنہ سیاحی ہے یارو دربدر جانے کا نام

عشق ہے بس حسن کی لو میں بکھر جانے کی بات
حسن کیا ہے، بزمِ وحشت میں سنور جانے کا نام

بے خبر داتا نہیں ہے کہ طلب کرنے پہ دے
ہے تمنا ہی دعاؤں سے اثر جانے کا نام

ہر طمع سے بے نیازی ہے قلندر کی صفت
سرفرازی، قامت وقد سے اتر جانے کا نام

ہے امامت سوئے حق یکسوئیِ قلب وذہن
اتباع کیا ہے، جدھر کہئے ادھر جانے کا نام

اختلاطِ حرف و معنیٰ کیا ہے ، تفہیمی جواز
فہم ہے مفہوم کے دل میں اتر جانے کا نام

یہ خموشی ہے فنِ نادر جہاں میں اے عزیزؔ
لب کشائی بیٹھے بیٹھے ہی ہنر جانے کا نام

تو ہے مضطرب اے زاہد، پسِ اضطراب کیا ہے
کوئی گر یہ تجھ سے پوچھے تو ترا جواب کیا ہے

تجھے ہے خبر کہ ہستی ہے رضائے حق میں مخفی
تو یہ خوف کیوں ہے تجھ کو کہ مآلِ خواب کیا ہے

جو صحیفۂ خرد ہے اُسے کھول کر تو پڑھ لے
کہ ترا نصیب کیا ہے ، کہ ترا نصاب کیا ہے

یہ حیاتِ بندگی ہے ، وہ متاعِ زندگانی
مرے دل مجھے بتادے ترا انتخاب کیا ہے

کبھی تو خوشی سے پاگل، کبھی غم سے تو ہے بوجھل
سرِ آسماں بھی رہ کر یہ ادا سحاب کیا ہے

شب و روز کا یہ کھٹکا ہے حرام ، یہ خبر ہے
مگر ایسے وسوسوں کا کہو سدِ باب کیا ہے

سرِ دار تو عیاں ہے ، پسِ طور تو نہاں ہے
کہیں بے حجاب تو ہے، کہیں یہ حجاب کیا ہے!

مجھے ہے قبولِ خلوت ، نہ یہ پوچھ مجھ سے لیکن
ترے حسنِ بے بہا سے مرا انتساب کیا ہے

اے عزیزؔ میں رہوں گا دمِ حشر تک نزع میں
یہ عتاب کم نہیں ہے کہ مرا حساب کیا ہے

گردشِ دوراں بتا یہ کس زمانے میں ہیں ہم — امنِ عالم کے پیمبر اور لڑنے میں ہیں ہم!

یہ اُچنبھا ہی سہی، پر کب اُچنبھے میں ہیں ہم — خود تماشائی بھی ہیں اور خود تماشے میں ہیں ہم!

ناخدا بے حس، مسافر اجنبی، اے دل بتا — اس سفینے سے ہیں باہر یا سفینے میں ہیں ہم!

سر پہ آ ٹھہری ہے اب تو جنبشِ لب کی سزا — پنجۂ بیداد کے ایسے شکنجے میں ہیں ہم!

تیر کر جو طے کیے تھے کل وہ تھا بحری سفر — ریت یہ سمجھا رہی ہے اب جزیرے میں ہیں ہم

صبح کے نکلے ہوئے ہیں منزلوں کی چھاؤں میں — سر پہ سورج ہے ندامت کے پسینے میں ہیں ہم

پتلیاں ہیں اپنی آنکھوں کی اگر روشن چراغ — دیکھنا یہ ہیکہ آخر کیوں اندھیرے میں ہیں ہم!

زینتِ تاجِ حمیت تھا وہ ہیرا تھے عزیز
اب خدا جانے کہاں اور کس دفینے میں ہیں ہم!

شعور و حوصلہ گر آگہی کا مل گیا ہوتا — سبب ہم کو ہماری بے بسی کا مل گیا ہوتا

بلندی اور پستی کی حقیقت پر نظر جاتی — تو سیدھا راستہ اس زندگی کا مل گیا ہوتا

غمِ ہستی ہی سے ہستی ہے، گر ہم یہ سمجھ لیتے — تدبر سے خزانہ ہر خوشی کا مل گیا ہوتا

اگر احساس کی نعمت کو یوں ضائع نہیں کرتا — ترے دستِ تہی کو دل سخی کا مل گیا ہوتا

نظر گر حسن کے جلووں کو خود میں جذب کر لیتی — صدائے دل کو نغمہ عاشقی کا مل گیا ہوتا

نہ بھرتی مانگ راہوں کی اگر آوارگی میری — نشاں رہزن کو اُنکی تیرگی کا مل گیا ہوتا

نہ ہوتا یہ بھرم کے آدمی رہتے ہیں شہروں میں — پتہ دشتِ جنوں میں آدمی کا مل گیا ہوتا

بھٹکتا کیوں میں در در چھانتا کیوں خاک صحرا کی — جو قسمت سے پتہ تیری گلی کا مل گیا ہوتا

نکل آتے جو ہم باہر حصارِ ذات سے اپنی
عزیز ہم کو صلہ اس بے خودی کا مل گیا ہوتا

مسیحِ میکدہ ، بیمار ہیں لا
اِدھر لا مئے یہاں میخوار ہیں لا
اُجالے میں نہیں پی سکتے ساقی
خُدارا صبح کے آثار ہیں لا
اِسی مرہم کی ہم کو جستجو تھی
ہمارے زخم ناہموار ہیں لا
صُراحی ہو یا کوزہ ہو کہ کاسہ
یہ سب پانی کے حصہ دار ہیں لا
سُبو لے لے مجھے تلوار دے دے
یہاں سب درپئے آزار ہیں لا
کہاں رکھی ہے سیڑھی یہ بتادے
پڑوسی ہیں کہ یہ مینار ہیں لا
مِرا چشمہ نہیں مِلتا ہے مجھ کو
مَناظر قابلِ دیدار ہیں لا
ذرا مجھ کو مِری بیساکھیاں دے
مُسافر اب صبا رفتار ہیں لا
مِرے ہاتھوں میں قِرطاس و قلم دے
یہ صَاحِب عَالِم ذخّار ہیں لا
نہ ڈالوں کیوں نہ اِن کے منہ پہ تالا
دَراڑیں بولتی دِیوار ہیں لا
جُھلاِ مت سامنے سُولی کا پھنّدہ
عزیز ہم عاشقانِ دَار ہیں لا

سب کو ملتی ہے کب خوشی یوں بھی — ہم کو عادت ہے رنج کی یوں بھی
غم سے گھبرا گئے تو حیرت کیا — آدمی تو ہے آدمی یوں بھی
مل بھی جائے تو کچھ نہیں حاصل — کون سی شئے ہے دائمی یوں بھی
جان لیوا سہی مگر ہمدم — زندگی ہے یہ زندگی یوں بھی
ہوش مندی ہے اور نہ بے ہوشی — آنکھ تو ہے کھلی ہوئی یوں بھی
دل میں احساسِ پائمالی ہے — مسکراتی ہے ہر کلی یوں بھی
وہ جو بدلے تو کیا تعجب ہے — ساری دنیا بدل گئی یوں بھی
تلخیوں سے ہیں پُر تری باتیں — گفتگو میں ہے چاشنی یوں بھی
اب سیاہی کا دور دورہ ہے — عمر کی شام ڈھل گئی یوں بھی
جِسم پھولوں میں مضطرب سا ہے — روح کانٹوں پہ سوگئی یوں بھی

کج کلاہی عزیزؔ وہ جانیں
ہے بھلی ہم کو سادگی یوں بھی

خوابوں کا پیرہن ہے خیالوں کا پیرہن — زیبِ دل و نظر ہے سرابوں کا پیرہن
ہلکے سے ایک لمس سے خوشبو مہک اُٹھی — پھولوں سا پیرہن ہے حسینوں کا پیرہن
شائد گھٹائیں ٹوٹ کے برسی ہیں رات بھر — بھیگا ہوا ہے آپکی آنکھوں کا پیرہن
دھونا مگر حضور بڑی احتیاط سے — دیکھو، بہت لطیف ہے زخموں کا پیرہن
عیبوں کو ڈھانکنے کا سلیقہ نہیں اِسے — بس تن کو ڈھانکتا ہے غریبوں کا پیرہن
کیسے سیوگے دامنِ قسمت ہے تار تار — نا قابلِ رفو ہے نصیبوں کا پیرہن
یہ کیسا اِنقلابِ زمانہ ہے دوستو! — ہر روز مختلف ہے عذابوں کا پیرہن

دل میں یہ آرزو ہے کہ یونہی رہے عزیزؔ
اِس پھول سے پیکر یہ حجابوں کا پیرہن

۱۹۷۶ء میں سعودی عرب کو روانگی کے بعد۔ رفیقِ حیات کا انتباہ

جو زندگی کے سفر میں آئیں وہ دشت و صحرا کھنگال رکھنا
مگر خراماں نسیمِ صبح کی طرح بے باک چال رکھنا
کسی کو کوئی جواب دینا نہ لب پہ کوئی سوال رکھنا
یہ اَسلحے سب بناوٹی ہیں نہ تیغ رکھنا نہ ڈھال رکھنا
ہوا مخالف ، جہاں مخالف ، زمیں مخالف ، زماں مخالف
یہ موسمِ اختلاف ہے تم زبان اپنی سنبھال رکھنا
یہ دل کا شیشہ نہ ٹوٹ جائے ، نہ دھول آئے ، نہ میل آئے
کہیں نہ ہاتھوں سے چُھوٹ جائے ، سفر میں اِس کا خیال رکھنا
نئی رُتوں کی ہوا لگے تو اسے بھی باہوں میں لے اُڑے گی
گئی رُتوں کی مہک ہیں یادیں ، دلِ حزیں میں سنبھال رکھنا
سُنا ہے وہ سیم و زر کی بستی ، جہاں بلندی میں بھی ہے پستی
اُنہیں مبارک غرور و مستی ، نہ دل پہ اِس کا ملال رکھنا
ہوا کے بل پر جو شئے اُڑے گی ، کہیں کسی جا وہ جا گرے گی
عروج پر ہر قدم ہو لیکن نظر میں جائے زوال رکھنا
کوئی جو دیکھے ، نہ پوچھ بیٹھے ، یہ حال کیسا بنالیا ہے
نہ شخصیت ہو تمھاری رسوا یوں غم میں خود کو نہ ڈھال رکھنا
اُداسیوں کا جو سامنا ہو تو قہقہوں کے نشے میں جُھومو
مصیبتیں تو لگی ہوئی ہیں جسارتوں کو بھی پال رکھنا
تُمھاری راہوں کو تک رہے ہیں ، تُمھاری یادوں میں جی رہے ہیں
عزیز ہو تم سبھی کے لیکن ہمارا بھی کچھ خیال رکھنا

گھر سے نکلے تھے اندھی خوشی کیلئے
دیدہ ور غم ملے رہبری کیلئے

حاجتوں نے ہمیں ہجرتیں سونپ دیں
گھٹ کے مرنا پڑا زندگی کیلئے

نقصِ تدبیر و تقدیر کیا چیز ہے
ہم سزاوار ہیں خود کشی کیلئے

ڈیڈی آجایئے اب وطن لوٹ کر
میں نکل جاؤں گا نوکری کیلئے

اِس طرف بے بسی ، اُس طرف بے کسی
درمیاں کفر ہے منصفی کیلئے

برہمن کیلئے ہر ستم راس ہے
ظلم سب ہیں روا شیخ جی کیلئے

سب درندوں کی اِک انجمن بن گئی
کوئی محفل نہیں آدمی کیلئے

مُفلسی الوداع کہہ کے چھوڑی تھی کل
آج رُسوائی ہے رُخصتی کیلئے

کیوں دھواں ہی دھواں ہے عزیز ہر طرف
دل جلے یا مکاں روشنی کیلئے

کیوں سفر میں ہی رہا کرتے ہیں اکثر قافلے
اب کہاں رُکتے ہیں ٹھنڈی چھاؤں پاکر قافلے

کیا سفر ہی اِن کی منزل ہے کہ رُکتے ہی نہیں
ہوگئے ہیں کس لئے یوں گھر سے بے گھر قافلے

ذہن پر اندھے سفر کا جیسے کچھ صدمہ نہ ہو
تان کر سوتے ہیں یوں سپنوں کی چادر قافلے

آرہے ہیں کر کے سر دیکھو تو کتنی منزلیں
دشت و صحرا، پربت و دریا، سمنّدر، قافلے

چاہے کتنا ہی فریبی ہو سمندر کا سکوت
پڑھ لیا کرتے ہیں طوفانوں کے تیور قافلے

سر پہ چڑھتی دھوپ ہے ہر سُو سُلگتا ریگزار
دل میں رکھتے ہیں تمنائے گُل تر قافلے

چھاؤں دیکر دھوپ سہنے میں کٹی اشجار کی
چل دیئے لیکر متاعِ زن، زمیں، زَر قافلے

کیا خبر، کب ختم ہوگا اس سفر کا سلسلہ
روزِ اوّل سے سفر میں ہیں برابر قافلے

صُبح کے آثار ہوں یا شام کا عالم عزیزؔ
خود ہی اُڑجاتی ہیں سب چڑیاں بنا کر قافلے

پھر سفر پر جارہے ہیں ہمسفر کو چھوڑ کر
برسرِ پرواز ہیں دیوار و در کو چھوڑ کر

منزلِ مقصود آگے ہے کہ پیچھے رہ گئی
وسوسے میں پڑگئے ہیں رہ گذر کو چھوڑ کر

بڑھ رہے ہیں جانبِ صحرا ہوا کے دوش پر
اپنے پیچھے راستے کے ہر شجر کو چھوڑ کر

آشیانہ ڈھونڈتے ہیں ہم دیارِ غیر میں
اپنی دنیا، اپنی بستی، اپنے گھر کو چھوڑ کر

عرش تک اِسکی رسائی ہوگئی تو کیا ہوا
لوٹ آئی ہے دعا میری، اَثر کو چھوڑ کر

غم سے بوجھل ذہن میں کچھ کر گذرنے کا جنوں
دل کو ڈھارس دے رہا ہے، دردِ سر کو چھوڑ کر

حاجتیں در کھول دیتی ہیں، مگر وقتِ سفر
ٹوکتی ہیں، جارہے ہو بام و در کو چھوڑ کر؟

جا مِلے آخر غُبارِ منزلِ ناکام سے
پیچھے پیچھے غمزدہ گردِ سفر کو چھوڑ کر

اَبر باراں ڈھونڈنے نِکلے ہو صحرا میں عزیزؔ
گھر کے سبزہ زار پے برق و شرر کو چھوڑ کر!

سن کے جس کو دل مچل جائے وہ نغمہ بھیج دو
اس اُداسی میں خوشی کا ایک لمحہ بھیج دو
جو تمھارے ساتھ گذرے تھے جنونِ عشق میں
ہو سکے تو پھر وہ دن اور وہ زمانہ بھیج دو
پھر بہارِ زندگی کا عکس آئیگا نظر
" آئینہ خالی پڑا ہے اپنا چہرہ بھیج دو "
کروٹیں لیتی ہیں ہر دم جو تمھاری یاد میں
اُن اُمنگوں کیلئے کوئی سہارا بھیج دو
چاہیئے گر داد تم کو حسن کے ہر شعر پر
اُس شگفتہ رو غزل کا ہم کو تحفہ بھیج دو
وہ جسے حاجت نہیں ہے کچھ شعاعِ شمس کی
اُس دمکتے رخ کی کرنوں کا اُجالا بھیج دو
پھر نئے طوفاں سمیٹے چھا رہی ہیں بدلیاں
اپنے گیسو ، اپنے آنچل کا سہارا بھیج دو
تم کو زحمت بھی نہ ہوگی ہم بھی خوش ہو جائینگے
کچھ نہیں تو ، کم سے کم سادہ لفافہ بھیج دو
تم تو آنے سے رہے پر خط کی صورت میں عزیز
چند لفظوں میں سہی اپنا سراپا بھیج دو

کبھی خیرات کو لوٹا نہ دینا
سخی کے ہاتھ میں کاسہ نہ دینا
خبر ہو ہاتھ کو ایسا نہ دینا
کہ اس دینے سے ہے اچھا نہ دینا
مری تصویر ہے ، رکھ اس کو دل میں
اسے دیوار پر لٹکا نہ دینا
دغا تعبیر نے دیدی تو کیا غم
مجھے اَئے خواب تو دھوکا نہ دینا
جو کہنا ہے اُسے کہدوں گا سب کچھ
مگر تم بیچ میں شوشہ نہ دینا
ہمارا خوں بہت ارزاں ہے ، پی لو
ہمیں پانی سہی ، مہنگا نہ دینا
نہا کر دھوپ میں آئے ہوئے ہیں
کہیں اس چھاؤں میں سلگا نہ دینا
میں آئینہ ہوں ، اپنے عیب دیکھو
مرے ہاتھوں میں آئینہ نہ دینا
عزیز اب تو سمٹنے کی گھڑی ہے
یوں اپنے آپ کو بکھرا نہ دینا

یارب جہاں میں کیسا طوفاں اُٹھا ہوا ہے ۔ ہنگام زندگی کا ہر سُو مچا ہوا ہے
حسرت ہے زندگی کی نہ موت کی تمنّا ۔ ہر آدمی کا دل کیوں پتھر بنا ہوا ہے
دل ہے مگر کسی کی اب آرزو نہیں ہے ۔ گھر میں چراغ تو ہے لیکن بجھا ہوا ہے
آلام و رنج و غم کی مصروف رہ گذر پر ۔ ہر شخص اِس جہاں کا تنہا کھڑا ہوا ہے
خاموش ہیں وہ جن کے خالی ہیں جام لیکن ۔ وہ معترض ہے جس کا پیالہ بھرا ہوا ہے
افکارِ زندگی سے بوجھل ہے ذہن پھر بھی ۔ دل ایسی بے کلی میں نغمہ سرا ہوا ہے
رسمیں نباہنے کو رشتے بنالیئے ہیں ۔ ورنہ کسی کا کوئی کب آشنا ہوا ہے
مانا کہ خوب تر ہے گلزارِ زیست لیکن ۔ آنکھوں پہ آج اپنی پردہ پڑا ہوا ہے

کل تک عزیزؔ جس کا پیشہ ہی رہ زنی تھا
قسمت سے وہ ہمارا اب رہ نما ہوا ہے

غمِ زندگی سے کہیئے، ہم کیوں نہ جی لگائیں ۔ سرِ شام جل اُٹھے ہیں، یہ چراغ کیوں بُجھائیں
مری کاوشوں کے صدقے مِرا بن گیا نشیمن ۔ کوئی بجلیوں سے کہدے مجھے پھر نہ آزمائیں
مجھے کب یہ آرزو تھی کہ ہو دور مجھ سے تو بھی ۔ اِدھر آ اے بیقراری کہ میں لوں تری بلائیں
میں چلا ہوں سوئے ظُلمت، مجھے تیرگی سے اُلفت ۔ نہ یوں روشنی دکھا کر مجھے دیجئے صدائیں
وہی بے دلی کے شِکوے، وہی بے رخی کی باتیں ۔ مرا ضبط دے رہا ہے تجھے رات دن دعائیں
سبھی یار دوستوں کے ہیں مزاج بدلے بدلے ۔ کسے حالِ دل سُنائیں، کسے زخمِ دل دکھائیں
وہ تمام بیتی یادیں مرے گھر سے لوٹ جائیں ۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں مرا در نہ کھٹکھٹائیں

اَے عزیزؔ اُن سے کہدو جو مجھے پرکھ رہے ہیں
کبھی اپنا جائزہ لیں کبھی خود کو آزمائیں

یاد کبھی جب آجاتی ہے بھولے ہوئے افسانوں کی   دل میں آنکھیں کھل جاتی ہیں سوئے ہوئے ارمانوں کی

پیار کے بدلے رسوائی دی وصل کے بدلے تنہائی   حیراں ہوں میں کیسے چکاؤں قیمت ان احسانوں کی

جل جل کے مر جانے پر تو سب نے ہی افسوس کیا   پر نہ کسی نے خاک اُٹھائی بڑھ کر ان پروانوں کی

محفل میں غیروں کی خاطر جب تو پہروں جلتی ہے   خاک بکھرنے لگتی ہے اَے شمع ترے پروانوں کی

رند ہیں سارے تشنہ تشنہ، ساقی بھی کچھ بیدل سا   دیواروں سے سر ٹکرائے کیوں نہ صدا پیمانوں کی

دن کو سکھ کی کھوج میں رہنا، رات بتانا آنکھوں میں   چین کی خاطر چین گنوانا، عادت ہے دیوانوں کی

دیمک جیسے چاٹ رہی ہے فکر جہاں لمحہ لمحہ   جب سے فراوانی ہے گھر میں جینے کے سامانوں کی

وقت کے طوفانی دھاروں کو یارو کب تک روؤگے   مال گیا تو جانے بھی دو خیر مناؤ جانوں کی

جُھوم کے قسمت ناچ رہی ہے آج سیاستدانوں کی   اب دنیا میں خیر نہیں ہے ہم جیسے نادانوں کی

وقت نے ایسا جالا پھینکا اپنا ہی خود ہوش نہیں   ایسے میں تکرار ہے بے جا اپنوں کی بیگانوں کی

کیسی بھلائی، کون ہے محسن، سب کہنے کی باتیں ہیں   انسانوں سے ہی دو بھر ہے یہ دنیا انسانوں کی

یوں تو شہر کے سارے چہرے ہیں جانے پہچانے سے   کبھی کبھی یوں لگتا ہے یہ بستی ہے انجانوں کی

کتنی صدیوں سے پیتی ہے روز لہو انسانوں کا

پھر بھی عزیزؔ اپنی یہ دنیا بھوکی ہے انسانوں کی

مری چاہتوں کی دنیا تری نفرتوں کے آگے
تری ہیچ محفلیں ہیں مری خلوتوں کے. آگے

کسی غم کا کچھ اثر ہے، نہ خوشی پہ یہ نظر ہے
وہ مقام آگیا ہے مری حسرتوں کے آگے

کوی زندگی کا طالب، کوئی زندگی سے بیدل
کوئی راحتوں کے پیچھے، کوئی آفتوں کے آگے

گلِ تر سے کوئی کہدے، پسِ دل نشیں تبسّم
وہ خزاں کھڑی ہوئی ہے تری نکہتوں کے آگے

نہ سہم شبِ سیاہ سے، ذرا دیکھ تو اُفق پر
ہے جہانِ نور پنہاں، اِنہیں ظُلمتوں کے آگے

تجھے ناز کیوں فلک ہے، بھلا اپنی وسعتوں پر
کئی اور آسماں ہیں تری رفعتوں کے آگے

اَےَ عزیزؔ اِن سے ہٹ کر کئی اور راستے ہیں
کئی اور منزلیں ہیں تری منزلوں کے آگے

۱۹۸۴ء حیدرآباد میں ہوئے فرقہ وارانہ فسادات پر۔۔۔ایک تاثر

اُجالے جس جگہ ملزم اندھیرے مدعی ٹھہرے
وہاں تاریکیوں کا نام کیوں نہ روشنی ٹھہرے

ہمارے ہی لیئے ہیں بند اپنے گھر کے دروازے
یوں اپنے در پہ ٹھہرے ہیں کہ جیسے اجنبی ٹھہرے

شہر کے ہر گلی کوچے میں قاتل چھپ کے بیٹھے ہیں
بچانے زندگی جاکر کوئی اب کِس گلی ٹھہرے

ٹھہر سکتا ہے صدیوں تک سمندر ایک حالت میں
مگر ممکن نہیں بہتا ہوا پانی کبھی ٹھہرے

کسی فتنے کا اندیشہ وہیں محسوس ہوتا ہے
جہاں پر آدمی کے ساتھ کوئی آدمی ٹھہرے

وفا کر کے بھی ہم تو بے وفا ہیں سب کی نظروں میں
تمھاری بے وفائی بھی ادائے دلبری ٹھہرے !

توقع کیا رہے باقی وہاں اب سرفرازی کی
خمیدہ سرد لاشوں پر جہاں شرمندگی ٹھہرے

یہ دنیا کارزارِ زندگی اور موت ہے ، اس میں
تمنا سرفروشی کی ہے جس کو بس وہی ٹھہرے

ان اُکھڑی اُکھڑی سانسوں پر ذرا قابو تو پالیں گے
اگر یہ وقت کی رفتار ظالم دو گھڑی ٹھہرے

سسکتے ہیں تو یوں ہنستے ہیں اربابِ ستم ہم پر
کسی کے دل کی بے چینی بھی جیسے دل لگی ٹھہرے

عزیزؔ ان سُونی گلیوں میں بہاریں لوٹ آئیں گی
مگر اُس دن کی خاطر کون ساری زندگی ٹھہرے

سہما سہما سا جہانِ رنگ و بو ہے اور ہوا
زندگی کا شور ہے یا ہا و ہُو ہے اور ہوا

کیسا موسم آج دَر آیا ہے باغِ زیست میں
شاخِ گل پہ پتّہ پتّہ دُو بدو ہے اور ہوا

جس سے سائے کی توقع تھی وہی آنگن کا پیڑ
گھر کی چھت پر اک بلائے خُوبرو ہے اور ہوا

بکھرے بکھرے سے یہ تنکے ، یہ غبار خار و خس
سر چُھپانے کی ہماری جستجو ہے اور ہوا

دھوپ کی شدّت سے ہے جس کا بدن تڑخا ہوا
اَبرِ باراں اُس زمیں کے روبرو ہے اور ہوا

اِس پہ قابو ہے نہ کوئی اُس پہ بس اَے زندگی
آج تک الجھا ہوا ہم سے عدو ہے اور ہوا

گِر چکا اشکِ ندامت کب کا تیری آنکھ سے
اب خود اپنی آگ کے شعلوں میں تو ہے اور ہوا

اس کی منزل ٹوکری ہے ، یا رِسالے کا ورق
میز پر میرے قلم کی آبرو ہے اور ہوا

اَے شبِ تاریک کوئی راستہ تو ہی بتا
ٹمٹماتا اِک چراغ آرزو ہے اور ہوا

بادبانوں کی طنابیں کھینچتے رہیئے عزیزؔ
اب سمندر ہی سمندر چار سُو ہے اور ہوا

ساری روداد وفا ساری حکایت پوچھو
اُس نے کس بات پہ دل توڑ دیا مت پوچھو

آج لیتے ہیں مکیں چین کی نیندیں جس میں
کس نے رکھی تھی وہ بنیادِ عمارت پوچھو

خار سے ، غُنچہ و گل سے ، نگہ گلچیں سے
سبق مِلا ہے ہمیں ، ہم سے حقیقت پوچھو

اپنی اُلفت سے جنہیں دی تھی حلاوت ہم نے
کیوں اُنہیں ہونٹوں پہ ہے تلخ شکایت پوچھو

کس نے پلکوں سے چنا ہے خس و خاشاک یہاں
کس نے گلزار کیا دشتِ محبت پوچھو

لوگ کرتے ہیں بہت اُنکی وفا کے چرچے
ہم ہیں رُسوائے جہاں کِس کی بدولت پوچھو

کِس نے مجبور کیا ترکِ تعلّق کے لئیے
کون ہے مجرمِ دستورِ محبّت پوچھو

کل جو دیتے تھے میرے حق میں گواہی اپنی
آج کیوں غیر کی کرتے ہیں وکالت پوچھو

فیصلہ صرف حقائق پہ جہاں ہوتا ہے
کون سے شہر میں ہے ایسی عدالت پوچھو

روز سُنتے ہیں کہ اِک روز قیامت ہوگی
کیا نہیں ہوتی یہاں روز قیامت پوچھو

جاں بہ لب ہوں میں عزیزؔ اب تو یہ نفرت چھوڑو
آج تو پیار سے بیمار کی حالت پوچھو

جب سے ہوئی ہے زحمتِ تکرار گفتگو
بھولے ہوئے ہیں صاحبِ گفتار گفتگو

بیٹھو غریب خانے میں کچھ چین سے کہو
ہم اور تم و یوں پسِ دیوار گفتگو ؟

کل تک یہی تھی زینتِ دیوانِ خاص و عام
اب ہوگئی ہے رونقِ بازار گفتگو

پتوں کو ورغلا رہی ہے سازشی ہوا
یا پیڑ کر رہے ہیں پر اسرار گفتگو ! ؟

کہتے ہیں جس کو خیر اسی شئے کا نام ہے
لیکن بوجہِ شر ہے گراں بار گفتگو

جس طرح گفتگو سے بہلتی ہے طبیعت
کرتی ہے اُسی طرح سے بیزار گفتگو

جب سے کہا ہے اُس نے کہ میں بے قصور ہوں
میں ہوں ، میرا ضمیر دھواں دھار گفتگو

آئینہ دارِ جذبۂ ہستی ہے دل عزیزؔ
کرتا ہے ہم سے روز کئی بار گفتگو

چاندنی سے چونکیں گے دھوپ میں نہائیں گے
یہ بھی اپنے سائے ہیں اپنی خود کھائیں گے

ململجی چراغوں پر اوس پڑ گئی تو کیا
دھندلے دھندلے سایوں سے شہر جگمگائیں گے

کچھ مفاد ہوتے ہیں ، ہر خلوص کے پیچھے
ورنہ دستکیں دنیا لوگ بھول جائیں گے

اِن سے دور مت رہنا ، اِن کو چھو نہیں لینا
یہ ہیں کانچ کے رشتے ٹوٹ پھوٹ جائیں گے

بے ثبات خوابوں کی ، بے ثمر ہے تعبیریں
ہم ضمیر کو ایسی نیند سے جگائیں گے

رہ نما و رہزن ہیں ایک جان دو قالب
ان کے بیچ دیواریں کس طرح اُٹھائیں گے !؟

نعمتیں یہ دنیا کی اِک سراب جیسی ہیں
سبز باغ کے یہ پھل کس کے ہاتھ آئیں گے

دیکھنا نہ چھوڑے گی یہ ہوا عزیزؔ اُن کو
جو لچکتی ٹہنی پر آشیاں بنائیں گے

رِشتے ، ناطے کیا ہیں اِک آزار ہے یہ
مِٹّی کے برتن کا کاروبار ہے یہ
پربت بھی ہیں اِس میں گہرے دلدل بھی
سنبھل کے رکھنا پاؤں میاں سنسار ہے یہ

اپنے ہر رستے پر دنیا حائل ہے
ہر منزل سے پہلے اِک دیوار ہے یہ
ذہن میں ہے امروز نہ آنکھوں میں فردا
سکتہ ہے یا گرتا ہوا معیار ہے یہ

آپ کے سر کی زینت ہے کس کی پیزار
قدموں میں جو ہے کس کی دستار ہے
پلک جھپکتے ہی جو ہم سے دور ہُوا
وہ اِک پل تھا ، اُس پل کی رفتار ہے یہ

ہم ہیں سوز تو ساز ہے یہ اپنی ہستی
ہم پائل ہیں ، پائل کی جھنکار ہے یہ
اس کے فن کے پروانے ہیں محلوں میں
کُٹیا اِس کا مسکن ہے فنکار ہے یہ

کھیل نہیں ہے یہ محنت ، یہ مزدوری
جس پر روٹی پکتی ہے وہ نار ہے یہ
سمجھوتا حالات سے ہے اِک کمزوری
جیت نہ کہنا اس کو عزیزؔ کہ ہار ہے یہ

چیختے در ، خامشی دیوار کی
لو حقیقت کھل گئی دیوار کی

کہہ رہے ہیں نرم بستر چھوڑدے
چڑھتا سورج اور گھڑی دیوار کی

اپنے سائے میں جگہ دیں یا نہ دیں
دھوپ کی مرضی ، خوشی دیوار کی

گھر کی باتیں کہہ گیا گھر کا ستوں
سُن چکا تھا اَن سُنی دیوار کی

گھر تو سارا بن چکا ہے خیر سے
رہ گئی ہے بس کمی دیوار کی

دو دِلوں کے فاصلے کا ذکر تھا
بات یہ اچھّی کہی دیوار کی

کیا کہیں آندھی کے پھر آثار ہیں
اہمیت کیوں بڑھ گئی دیوار کی ؟

ایک دروازہ ضروری تھا جہاں
اُس جگہ ، اُس نے کھڑی دیوار کی !

بوجھ گھر کا کس کے سر جائے گا اب
پوچھتی ہے یہ نئی دیوار کی

بیل بوٹے دھوپ میں . پھر آگئے
دو گھڑی کی چھاؤں تھی دیوار کی

پوچھتے ہیں دیکھ کر ملبہ سبھی
قتل تھا یا خود کُشی دیوار کی

غیریت کی بات ہی کیا ہے عزیز
جنگ ہے یہ آپسی دیوار کی

اہلِ دل ، اہلِ نظر ، اہلِ صفا بیٹھے ہیں
آج اربابِ سخن ایک جگہ بیٹھے ہیں

ذِکر چھیڑو تو فقط آج وفا کا چھیڑو
آج محفل میں سبھی اہلِ وفا بیٹھے ہیں

پھر بھڑکتا ہے دیا تند ہواؤں کے سبب
دو گھڑی دشت میں خیمہ جو لگا بیٹھے ہیں

اُن بگولوں سے بھی پوچھو کہ تھکاوٹ کیا ہے
دوشِ ساحل پہ جو سستانے ذرا بیٹھے ہیں

گھر کو آئے تھے جو اِظہارِ تاسف کیلئے
آگ بستی میں وہی لوگ لگا بیٹھے ہیں

طنز کا حق نہیں برسات پر اُن لوگوں کو
اپنا گھر اپنے ہی ہاتھوں سے جو ڈھا بیٹھے ہیں

کس کو ہوتی ہے بھلا تہمت و رسوائی عزیزؔ
ہم ہی ناداں ہیں جو احباب میں آبیٹھے ہیں

یہ حقیقت ہی نہیں ہے ایک افسانہ بھی ہے
دشمنی جن سے ہوئی ہے اُن سے یارانہ بھی ہے

بے وفائی اُنکا شیوہ ہی سہی لیکن مجھے
اُنکو آدابِ وفا کیا ہیں ، یہ سمجھانا بھی ہے

یہ چراغوں کو بجھایا ہی نہیں کرتی فقط
اس ہوا کا کام تو شعلوں کو بھڑکانا بھی ہے

شاخِ گل پر رہنے والو یہ خبر بھی ہے تمھیں
اس گلستاں کے کسی گوشے میں ویرانہ بھی ہے

جس نظر سے شمع کا جلنا نہ دیکھا جاسکا
اُس نظر میں کچھ مقامِ خاکِ پروانہ بھی ہے؟

سب میں رہ کر بھی الگ رہنے کی عادت پر مجھے
لوگ کہتے ہیں کہ دانا بھی ہے، دیوانہ بھی ہے

فصلِ گل میں کھل کے اِتراتے ہیں جو غنچے عزیزؔ
اُنکو کیا معلوم کہ اِک روز مُرجھانا بھی ہے

کانٹے نہ بچھا رکھنا ، خنجر نہ چھپا رکھنا
دشمن ہی سہی پھر بھی احساس وفا رکھنا

دنیا بھی کہیں تم کو قاتل نہ سمجھ بیٹھے
دستانے ذرا اپنے ہاتھوں پہ چڑھا رکھنا

آہوں کی کہیں دل سے مدبھیڑ نہ ہو جائے
سانسوں کو بھی سینے کی سرحد پہ تھما رکھنا

پانی نہ اگر برسے ساون کے مہینے میں
اشکوں سے اُمیدوں کی کھیتی کو ہرا رکھنا

کلیوں کے چٹخنے سے خوشبو تو مہکتی ہے
مشکل ہے ہواؤں سے یہ راز چھپا رکھنا

شاخوں کی پناہوں میں بیٹھے ہیں کئی تیہیں
پھولوں کی حفاظت پر کانٹوں کو لگا رکھنا

راتوں کی سیاہی میں رستہ نہ جہاں سوجھے
رفتار کو اُس پل بھی ، جگنو کی طرح رکھنا

دنیا نے تری آخر انجام کو پہنچایا
انجامِ دگر لیکن محشر پہ اٹھا رکھنا

فرقت میں بھی جب دل میں رہتا ہے تو پھر کہیئے
کیا اپنی خبر رکھنا ، کیا اس کا پتہ رکھنا

ہُشیار تو اوروں کی ، تقلید نہیں کرتا
پہچان عزیزؔ اپنی دنیا سے جدا رکھنا

چھوٹی سی اِس زمیں پہ کُشادہ مکان رکھ
اُس میں تو اپنے ساتھ کُھلا آسمان رکھ

دیوار نام کی نہ ہو کوئی بھی شئے جہاں
اپنے نیتے کے واسطے ایسا نشان رکھ

منہ میں زبان رکھ کے بھی جو بے زبان ہیں
اُن سب کی حق رسی کے لیے ، تو زبان رکھ

مجبوریاں یہ کہتی ہیں سوجا تو بھوکے پیٹ
اور بھوک کہہ رہی ہے کہ آہٹ پہ کان رکھ

زخمی طیور اپنے سبھی زخم دھو سکیں
دل کی زمیں پہ درد کا اِک سائبان رکھ

اپنی سطح سے سر ترا اونچا نہ اٹھ سکے
ایسی ہی اس زمین پہ اپنی اُڑان رکھ

تیری سرشت میں نہ ہو حرفِ جفا عزیزؔ
پیشِ نظر خلوص کی اک شمعدان رکھ

بظاہر بے زباں ہیں سب کے سب پر بات کرتے ہیں
سلیقہ دیکھنے کا ہو تو منظر بات کرتے ہیں

سحر دم جب پرندے چہچہاتے ہیں فضاؤں میں
تو یوں محسوس ہوتا ہے سخنور بات کرتے ہیں

وہ میرے سامنے تصویر کی مانند ہیں خاموش
وہی جب یاد آتے ہیں تو کھل کر بات کرتے ہیں

ستم حد سے سِوا ہو تو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
شکن ماتھے کی اُکساتی ہے تیور بات کرتے ہیں

لکیروں کو زبانِ حال دیدی ہے مُصوّر نے
ذرا دیکھے کوئی پیکر سے پیکر بات کرتے ہیں

کسی پتھر کے آگے کوئی پتھر کچھ نہیں کہتا
کہیں شیشہ دکھائی دے تو پتھر بات کرتے ہیں

یہ نظمِ میکدہ ہے یاں کوئی جنبش نہیں کرتا
صراحی حکم دیتی ہے تو ساغر بات کرتے ہیں

سمندر سے سفینے حالِ دِل اپنا نہیں کہتے
مگر ساحل سے سرگوشی میں اکثر بات کرتے ہیں

سفینہ جب کسی گرداب کے نرغے میں آتا ہے
قضاء چپ چاپ سنتی ہے مقدر بات کرتے ہیں

عزیزؔ اشکوں کی اِک تحریر سی بنتی ہے تکیئے پر
دلِ ناکام سے جب دیدۂ تر بات کرتے ہیں

دل کو ہے ملا کچھ تو سکوں جب سے لگی چُپ
کہنے پہ نہ اُکسا مجھے رہنے دے ابھی چُپ
گُفتار کی عادت نے تو رکھا نہ کہیں کا
بے شک یہ بھلی بات ہے کہ "سب سے بھلی چُپ"
کُھلنے بھی نہ پائے تھے عیادت کو مرے ہونٹ
کہنے لگی مجھ سے ترے آنکھوں کی نمی، چُپ
پروانے کی چیخوں سے تو محفل میں تھا کہرام
شب بھر تو جلی شمع مگر، پھر بھی رہی چُپ
تھک ہار کے چپ سادھ لیں بیتاب نگاہیں
لیکن یہ تیرے حسن کی تصویر نہ تھی چپ
کیا سانپ گیا سونگھ مرے شہر وفا کو
بازار ہیں خاموش تو ہر ایک گلی چُپ
وہ ضبط کہاں ہے جو سنے دھڑکنیں دل کی
وہ نُطق کہاں ہے جو کہے دل کی لگی چُپ
سمجھو کہ ہوا ختم وہیں سارا فسانہ
ہوجائے جہاں دل کی زباں ایک گھڑی چُپ
کھیتوں پہ برسنے سے نہ تھا کوئی اِفادہ
شائد یہ سمجھ کر ہوئی ساون کی جھڑی چُپ
چلتی ہے عزیزؔ کب یہ ہوا ایک ہی رخ پر
دنیا کا یہی حال ہے، میری نہ تری چُپ

یوں اپنی راستی پر اُترا ہوا ہے شیشہ　　جو چیز سامنے ہو دِکھلا چُکا ہے شیشہ

یہ کیسی دُھوپ نکلی دامن میں آگ لیکر　　کمھلا گئے ہیں چہرے دُھندلا گیا ہے شیشہ

انسانیت کے ٹکڑے بکھرے پڑے ہوئے ہیں　　اخلاق گر گئے. یا نیچے گرا ہے شیشہ

حیران سی نگاہیں ہر اک سے پوچھتی ہیں　　دِیوار سے لِپٹ کر کیوں رو رہا ہے شیشہ

دیوار پر تھا جب تک محفوظ تھا وہ لیکن　　ہاتھوں میں جب سے آیا سہما ہوا ہے شیشہ

اُتری ہوئی ہے صورت اُنکی تو اِس لیے ہے　　اُن کی دلیل ساری جھٹلا گیا ہے شیشہ

دھوکے کی ساری چیزیں شوکیس میں سجی ہیں　　کھوٹی ہے چیز اُتنی جتنا کھرا ہے شیشہ

اب اپنی شخصیت بھی شیشوں میں بٹ گئی ہے　　شیشے کے سامنے اِک رکھا ہوا ہے شیشہ

اپنی انا کی خاطر اب اِس کو توڑ دیجیے　　اپنی اَنا کا لوہا منوا چکا ہے شیشہ

دے کر حیا کا پارہ بھر دی ہے جان اِس میں　　اُس شیشہ گر نے جیسا چاہا بنا ہے شیشہ

حیرت عزیز ہے تو اِس بات کی ہے حیرت
تاریکیوں میں کیسے دیکھا گیا ہے شیشہ

چراغوں کے سلگنے سے اندھیرا کم نہیں ہوتا
نکلتا شب کو بھی سورج تو کوئی غم نہیں ہوتا

تمھارے ساتھ ہی رونق بھی رخصت ہوگئی گھر سے
اگر اک تم نہیں جاتے تو یہ عالم نہیں ہوتا

ں تو ہمنواؤ فتح و نصرت کی علامت ہے
شکستِ فاش میں تو ہاتھ میں پرچم نہیں ہوتا !

انا کو توڑ دیتی ہے پشیمانی بھی کیا شئے ہے
مگر یہ سر بھی ہے کیا چیز ظالم خم نہیں ہوتا ؟

نمایاں عیب ہیں اپنے مگر عبرت نہیں ہم کو
یہی اِک بات ہے جس کا کہیں ماتم نہیں ہوتا !

یہ مانا جذب کی فطرت سے عاری ہے ، حقیقت ہے
مگر یہ بھی نہیں ہے سچ کہ پتھر نم نہیں ہوتا !

سفر بے کیف ہوجاتا عزیزؔ ہم سرفروشوں کا
سمندر کے تموّج میں جو زیر و بم نہیں ہوتا

خاکِ پروانہ کی طرح بانکپن کے ساتھ ہوں
میں بکھر کر بھی تمھاری انجمن کے ساتھ ہوں

رات بھر جلتا رہا ہوں میں چراغوں کی طرح
ضَوفشاں پھر صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہوں

اس قفس کی ساری دیواریں محافظ بن گئیں
میں سلامت ہوں بھی تو سر پر کفن کے ساتھ ہوں

ہر بلا اطراف ہے تو کیا کہ ہے سب کا عِلاج
حادثوں کے درمیاں بھی کس جتن کے ساتھ ہوں

بیدخل کرنا نہ ویرانے سے بھی اہلِ چمن
گو میں ویرانے میں ہوں لیکن چمن کے ساتھ ہوں

یہ بھی میری زندگی کا اک حصّہ بن گئی
ہے گھٹن ہمراہ میرے، میں گھٹن کے ساتھ ہوں

وقت نے پَر دیدیئے ہیں چھین کر بیساکھیاں
زندگی کی دوڑ میں اب میں ہرن کے ساتھ ہوں

آنکھ کہتی ہے چٹانوں میں بسیرا ہے عزیزؔ
دل یہ کہتا ہے کہ میں ایک کوہ کن کے ساتھ ہوں

نہ کچھ خوشی کی خوشی ہوئی ہے نہ کوئی غم کا اثر ہوا ہے
نہ اُنکی باتیں ، نہ اپنا دُکھڑا ، بس اِک خموشی کا سلسلہ ہے

یہ میری سانسیں تمھاری سانسوں میں غرق ہو کر بھی کہہ رہی ہیں
کہ دو دھڑکتے ہوئے دِلوں میں ابھی تو صدیوں کا فاصلہ ہے

مرے ہی گھر کے دَر و دَریچے عجیب نظروں سے دیکھتے ہیں
میں اُن کی نظروں میں اجنبی ہوں ، مِرا لہو جن میں بہہ رہا ہے

سکوں کی خاطر جدھر سے گذرا ، سُلگتی خوشیوں کی آنچ آئی
گلوں کے سینے جلے ہوئے ہیں ، چمن کا چہرہ بُجھا بجھا ہے

نہ کوئی طالب ہے یاں خوشی کا ، نہ کوئی محتاج زندگی کا
مرے شہر کا ہر ایک شہری یوں وقت اپنا گذارتا ہے

نہ دن کا مقصد ، نہ شب کا معنٰی ، نہ ذِکر ماضی ، نہ فِکر فردا
جدھر ہوائیں بہارہی ہیں ، اُدھر یہ سیلاب بہہ رہا ہے

سِتم ہے میری اُداسیاں بھی نظر میں سب کی کھٹک رہی ہیں
کہ جیسے یہ مال تھا کسی کا اور اُس کو میں نے چُرالیا ہے

جہاں سکوں کے تھے بیج بوئے ، وہاں پہ دُکھ کی فصل کھڑی ہے
اِسے تعجب سے تم نہ دیکھو نئی رُتوں کا یہ معجزہ ہے

عجب تری انجمن ہے ساقی ، کہ دیکھ کر انتشار میں نے
جو ذِکر امن و امان چھیڑا تو ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہے

جو سر پہ ہے اُس غموں کی چھت کو سُتون بن کر سنبھالنا تھا
عزیز میرے دِل حزیں نے یہ بوجھ ہنس کر اُٹھالیا ہے

دن دہاڑے آرزوئے زندگی کرتے ہوئے
آج پھر پکڑے گئے ہیں خودکشی کرتے ہوئے

کب اُجالوں میں بدلتے ہیں اندھیرے رات کے
تھک گئے ہم رات ساری روشنی کرتے ہوئے

فیصلہ ہوگا مرا شاید مرے مرنے کے بعد
زندگی تو کٹ رہی ہے پیروی کرتے ہوئے

حد سے آگے بڑھ گیا ہے بادبانوں کا فساد
کشتیاں بھی تھک چکی ہیں ثالثی کرتے ہوئے

رنگ و روغن، رعب و رعنائی گنوا بیٹھے ہیں ہم
کاکلِ ہستی تری صورت گری کرتے ہوئے

آپ اپنا خون پینا ضبط کی معراج ہے
آدمی بن جایئے یوں میکشی کرتے ہوئے

لاکھ سرگوشی سہی، دیوار پھر دیوار ہے
راز کہدے گی ہوا سے دوستی کرتے ہوئے

دشت سارا جل رہا ہے گمرہی کی آگ میں
پھر ہوائیں گھومتی ہیں رہبری کرتے ہوئے

اجنبی سی ہوگئیں گلیاں عزیز اُس شہر کی
عمر جس میں کٹ گئی سوداگری کرتے ہوئے

میں تمھارا ہوں یہ تم نے کیا کہا کوئی نہیں !
اس سے بڑھ کر زندگی کا حادثہ کوئی نہیں !

میں قریب آتا گیا جو دُور تم ہوتے گئے
اب بھی مجھ میں اور تم میں فاصلہ کوئی نہیں

میں مسافر ہوں وہی جس کی نظر کے سامنے
منزلیں ہی منزلیں ہیں ، راستہ کوئی نہیں

اس قدر پابندِ قانونِ حیاتِ نو ہیں ہم
اب ہماری زندگی کا قاعدہ کوئی نہیں

آج دنیا لگ رہی ہے شب کا سناٹا مجھے
سارا عالم نیند میں ہے جاگتا کوئی نہیں

احترام جام و مینا ہے نہ ساقی سے غرض
میکدے میں آج رند باوفا کوئی نہیں

تیری صورت، تیرا جلوہ، تیری آنکھیں، تیری دید
آئینے میں تو ہی تو ہے دوسرا کوئی نہیں

زیست کا ہر ایک پہلو اِک پہیلی ہے عزیزؔ
یہ وہ نکتہ ہے کہ جس پر سوچتا کوئی نہیں

ہم کو دیوانہ نہ سمجھو ہم ہیں موجی آدمی
سیدھے سادھے ہیں مگر ہیں اِنقلابی آدمی

دل ہمارے مختلف ہیں شخصیت بھی مختلف
تم سیاسی آدمی ہو ہم سماجی ، آدمی

آدمیت کے تقاضوں سے نہیں جو بہرہ ور
ناز ہے اُنکو کہ وہ ہیں خاندانی آدمی

زندگی جس کی ریاکاری ، عبادت مکر و فن
ایسے زاہد سے تو بہتر ہے شرابی آدمی

نفرتوں کا بیج بونے سے اگا ہے جو یہاں
کر رہا ہے اُس شجر کی آبیاری آدمی

آسمانی آفتوں کو کوستا ہے کس لیئے
اس زمیں پر جب مچاتا ہے تباہی آدمی

دل میں احساس بھلائی ہے درندوں کیلیۓ
پر نہ چاہے آدمی کی خیر خواہی آدمی

امن کے پیغمبرو سر سے کفن باندھو اُٹھو
سر اُٹھاتے ہیں جہاں میں پھر فسادی آدمی

لاکھ سمجھاؤ سبق انسانیت کا اَے عزیزؔ
کب اِسے خاطر میں لاتا ہے سیاسی آدمی

یوں نہ جذبات کے دھارے میں مچل کر تیرو
موج در موج تلاطم ہے، سنبھل کر تیرو

تم پہ جھپٹے جو کسی وقت ڈبونے کیلئے
پنجۂ موجِ مخالف کو کچل کر تیرو

ہے بظاہر تو سمندر کی طبیعت میں سکوت
اس تغافل میں نہ قابو سے نکل کر تیرو

چھیڑ کر وہ جو سفینوں کو گذر جاتی ہیں
رُخ ذرا ایسی ہواؤں سے بدل کر تیرو

چشمِ میگوں کی لطافت تو ہے شبنم سے لطیف
اس حسیں جھیل کے پانی میں سنبھل کر تیرو

آنکھ لگ جائے نہ موجوں کے بچھونے پہ کہیں
بند ہوتی ہوئی آنکھوں کو مسل کر تیرو

آگ پھیلی ہوئی ہے سارے سمندر میں عزیزؔ
جلتی موجوں کا تقاضہ ہے کہ جل کر تیرو

سوچتے ہیں حل مسائل کا تو تھک جاتے ہیں لوگ
اپنا سایہ ڈھونڈنے کو دور تک جاتے ہیں لوگ

خود اُلجھ جاتے ہیں اکثر بے بسی کے جال میں
جب کوئی تنقید کرتا ہے تو [illegible] جاتے ہیں لوگ

جب ذرا خوش ہوں تو جھولے ڈالتے ہیں شاخ پر
اور صدمہ ہو تو شاخوں پر لٹک جاتے ہیں لوگ

لُطف آتا ہے بھٹکنے میں جو دورانِ سفر
سیدھا رستہ چلتے چلتے بھی بھٹک جاتے ہیں لوگ

سائباں ہیں ہم تمھارے یہ، کہتے ہیں سب
جب ذرا بارش ہو چکے تو کھسک جاتے ہیں لوگ

ان کے خیر و شر میں اکثر کر نہیں سکتے تمیز
کچھ نمک اس طرح زخموں پر چھڑک جاتے ہیں لوگ

ہوں اگر بیکار تو چبھتے ہیں سب کی آنکھ میں
کام کرتے ہیں تو نظروں میں کھٹک جاتے ہیں لوگ

ہر کسی کو اپنا رہبر مان لینے سے عزیزؔ
منزلوں تک آکے بھی اکثر بھٹک جاتے ہیں لوگ

مولانا محمد بن عرب خلیل شکیبؔ صاحب بعارضۂ کینسر جدہ سے پاکستان لوٹ رہے تھے
وداعی تقریب میں منظوم نذرانۂ عقیدت (۱۹۸۵ء)

فرقت کے پھر یہ شام و سحر دے گیا کوئی
تحفہ ہمیں بوقتِ سفر دے گیا کوئی

جتنی حقیقتیں تھیں سبھی ساتھ لے گیا
اِک خواب ان آنکھوں کو مگر دے گیا کوئی

اب تک وہیں پہ ٹھہری ہوئی ہے مری نظر
جس راستے کو گردِ سفر دے گیا کوئی

وہ یوں گیا کہ مڑ کے بھی دیکھا نہ ایک بار
تکنے کو فقط راہ گذر دے گیا کوئی

رونق بھی گھر کی ہوگئی رخصت اسی کے ساتھ
گھر لے گیا ہے ساتھ، کھنڈر دے گیا کوئی

مُنصف بھی جانتا تھا کہ مجرم تھا کوئی اور
افسوس ہے کہ دار پہ سر دے گیا کوئی

چُپ ہیں کہ ہم کو صبر کی تلقین کر گیا
کیسے کہیں کہ زخمِ جگر دے گیا کوئی

منزل قریب ہی تھی کہ کیا جانے کِس لیئے
یوں ساتھ چھوڑنے کی خبر دے گیا کوئی

گیتوں میں نظم و نثر میں، غزلوں کی شکل میں
جو کچھ تھا اپنا زادِ سفر دے گیا کوئی

اس تیز دھوپ میں بھی گھنی چھاؤں مل گئی
اِک ایسا سایہ دار شجر دے گیا کوئی

چمکے ہیں مثلِ چاند شبِ ہجر اَے عزیزؔ
وہ داغ دل وہ داغِ جگر دے گیا کوئی

شکیبؔ صاحب کے انتقالِ پُر ملال پر۔۔ایک شعر

جو سرفراز ہو کے بھی رہتے ہیں سرنگوں
اُن عالموں کا یارِ طرح دار چل بسا

دوسروں کا درد اکثر ایک افسانہ لگا
کرب کیا ہے ، چوٹ خود کھائی تو اندازہ لگا

سب پرندوں کا تھکے ہارے گھروں کو لوٹنا
شام کا منظر وہ دھندلا ، کتنا سنجیدہ لگا

بے زباں ، بوجھل قدم ، اِک دوسرے سے بدگماں
ہر کوئی اِک شاخ سے ٹوٹا ہوا پتہ لگا

جو پہنچ سے دور ہو وہ روشنی کس کام کی
اپنے گھر کا ہے ، اندھیرا ہی سہی ، اچھا لگا

روشنی کا قحط تھا ، بے نور تھے منظر سبھی
اس لئیے بے چین سا محفل میں پروانہ لگا

شیشہ گر تھا وہ اُسے کس نے مصور کہہ دیا
اُسکو تصویریں نہیں ، بس آئینہ اچھا لگا

حال سارا کہہ چکے ہو تم سمندر کا عزیزؔ
موج نے جو کچھ کہا وہ ماجرا کیسا لگا

جانے دل کا چراغ تھا کیسا　　جلتے جلتے یہ بجھ گیا کیسا

روشنی کا ہے زاویہ کیسا　　بن گیا سایہ نور کا کیسا

بے بسی ہے، گھٹن ہے، وحشت ہے　　ہوگیا، پر یہ سب ہوا کیسا

اتنی قدرت اسے ملی کیسے　　زہر پانی میں گھل گیا کیسا

بیچ دی چھاؤں دھوپ کی خاطر　　ہم نے سودا یہ کرلیا کیسا

اپنے پھل پھول آپ کھاتا ہے　　پیڑ آنگن میں یہ اگا کیسا

ٹھیس شائد کسی نے پہنچائی　　آپ ہی ٹوٹا آئینہ کیسا

ہوش اپنا ہے اور نہ منزل کا　　آگیا ہے یہ راستہ کیسا

دیکھتا ہے عجیب نظروں سے　　یہ ہمارا ہے آشنا کیسا

سر پہ الزام گر تمہیں لوگے　　کہیئے پھر ہوگا فیصلہ کیسا

کاٹتے ہیں، یہ خود نہیں کٹتا　　پوچھئے مت کہ دن کٹا کیسا

خون پیتے ہو کیوں عزیزؔ اپنا

ایسا اس میں ہے ذائقہ کیسا

خوبصورت سی یہ غالی زندگی   خوابِ غفلت میں گنوالی زندگی
یہ منظّم چاند ، تاروں کا جہاں   یہ ہماری — لا اُبالی زندگی
سونچنا ہے کیا دیا ہم نے اسے   مانگتی ہے کچھ سوالی زندگی
ہے یہ مَندر کی سُنہری مورتی   یا بھکارن کی ہے تھالی زندگی
بند مُٹھّی میں یہ لاکھوں کی لگے   کھولئے تو ہاتھ خالی زندگی
شُوخ و چنچل اِک گلہری کی طرح   پھر رہی ہے ڈالی ڈالی زندگی
راستے پُر ہیں سبھی تیرے سبب   منزلیں ہیں تجھ سے خالی زندگی
دُور تک جلتا ہوا صحرا جہاں   اُس پہ تپتے پاؤں والی زندگی
جس نے سُن لی وقت کی آواز کو   اُس نے حِکمت سے بنالی زندگی
جس نے پایا ہے اُسی نے کھودیا   جس نے کھویا اُس نے پالی زندگی
قہقہے ، سرمستیاں ، پھر سسکیاں   کتنے پیمانوں میں ڈھالی زندگی
موت ہے اِک روزِ روشن کی طرح   ہجر کی شب سی ہے کالی زندگی
اب نہ سمجھاؤ ، سبق ہم پڑھ چکے   ہے ہماری دیکھی بھالی زندگی

جو اُصولوں کو سدا رکھّے عزیز
اِک وہی تو ہے مثالی زندگی

ہے دنیا کا نہ ملنا گر مصیبت　جو مِل جائے تو آفت در مصیبت

ہے جنت یوں تو اِسکا کونا کونا　جو سچ پوچھو تو گھر کا گھر مصیبت

مخالف سربراہانِ سفر ہیں　ہے اس حالت میں ہر منظر مصیبت

سنہرے خواب ہیں وجہِ تسلّی　مگر تعبیر کا دفتر مصیبت

تمنّا پر تمنّا پر تمنّا　مصیبت پر مصیبت پر مصیبت

گھروں میں لوگ سب سمٹے ہوئے ہیں　پڑی ہے پاؤں پھیلا کر مصیبت

وسائل کی شِکستہ رہ گذر پر　مسائل کا جو ہے لشکر مصیبت

یہاں تو دور تک راحت نہیں ہے　کہاں چھوڑی ہمیں لا کر مصیبت

ہماری فطرتوں کا آئینہ ہے　ہماری ذات کا مَظہر مصیبت

ہماری پیٹھ پر ہے بوجھ بھاری　اور اُس پہ وقت کا خنجر مصیبت

مصیبت کے نشانے پر دل و جاں　شعور و ذہن کی زد پر مصیبت

عزیزؔ ہم سب سکوں کے منتظر ہیں
کھڑی ہے سب کی چوکھٹ پر مصیبت

سایہ جو اونچے گھر کا ہمارے صحن میں ہے
لگتا ہے اپنے گھر کا مقدر گہن میں ہے

ہر شب کو چاند تاروں کی سجتی ہیں محفلیں
تنہا یہ آفتاب ہی کیوں انجمن میں ہے

مالی ہی پہ موقوف ہے غنچوں کی دیکھ بھال
لیکن یہ اہتمام یہاں کِس چمن میں ہے ؟

کلیوں میں چٹخنے کی جگاتی ہے آرزو
وہ آب و تاب صبح کی پہلی کرن میں ہے

ماتھے کے سِلوٹوں میں ہیں پنہاں کئی سوال
اُنکا ہر اک جواب نمایاں نین میں ہے

اہلِ وفا و [illegible]بِ سُخن سے ہے مالا مال
اِک آسمان ایسا بھی ارضِ دکن میں ہے

کتنی سمٹ گئیں ہیں یہ لمبی مسافتیں
دل ہے دیارِ غیر میں دھڑکن وطن میں ہے

کس کو عزیز ہوتی نہیں نیند رات کی
اچھی صحت کا راز بھی پنہاں تھکن میں ہے

سعودی عرب سے مُستقلاً واپسی پر حلقۂ ارباب ذوق، جدہ کی منعقدہ وداعی تقریب میں ایک تاثر
(اپریل / ۱۹۸۶ء)

در پہ سائل کی طرح آ کے ٹھہر جاتا ہے
اتنا بیزار کبھی وقت بھی کر جاتا ہے

یوں ٹھہر جاتے ہیں ایّام بھی چلتے چلتے
جیسے راہ گیر سرِ راہ ٹھہر جاتا ہے

کتنے ان دیکھے الم ساتھ ہوا کرتے ہیں
جب سفر پر کوئی بے اذنِ سفر جاتا ہے

گھر کے سامان کی مانند ہوں بکھرا بکھرا
گھر بکھر جائے تو انسان بکھر جاتا ہے

جوشِ سیلاب ہے برسات کے بل پر ورنہ
خشک سالی ہو تو دریا بھی اُتر جاتا ہے

کیا نئی بات ہے دنیا جو مُکر بیٹھی ہے
سر پہ سورج ہو تو سایہ بھی مکر جاتا ہے

طور جینے کے ضروری ہیں جہاں میں ورنہ
جس کو جینے کا سلیقہ نہ ہو مر جاتا ہے

آج اُمید کی پھر ایک کرن لیکے عزیزؔ
صبح کا بھولا ہوا شام کو گھر جاتا ہے

۱۹۸۶ء وداعی تقریبوں میں پڑھی ہوئی غزلیں

بمکان معزز و مخلص دوست ابوظفر

ہونی تو ہو کر رہے گی ، بے بسی رہ جائیگی
جستجو ، خود اپنا منہ تکتی ہوئی رہ جائیگی

ہوش پر ہوجائے گا حاوی جنونِ بے حسی
عقل اپنی کھڑکیوں سے جھانکتی رہ جائیگی

لے اُڑے گی راہ سے ہم کو مقدر کی ہوا
آرزو محور پہ اپنی گھومتی رہ جائیگی

زندگی ہے وہ شراب کیف و مستی کہ جسے
پیجئے جی بھر کے پھر بھی تشنگی رہ جائیگی

توڑ کر بندھن چلا جائے گا قیدی قید سے
اپنی تنہائی پہ روتی ہتھکڑی رہ جائیگی

خاک ہوجائیگا پروانہ فنا ہوجائیگا
جذبۂ اُلفت کو دنیا جانچتی رہ جائیگی

گھر سے لیکر گور تک ہوگا خموشی کا سفر
زندگی اپنا جنازہ دیکھتی رہ جائیگی

نام لیوا قبر پر ہوگا نہ کوئی اَے عزیزؔ
اِک ہمارے نام کی تختی لگی رہ جائیگی

اگر بے اعتنائی سے روانہ ہوگیا ہوتا
جہاں اسباب رکھدیتا ٹھکانہ ہوگیا ہوتا

نہ ہوتی فکر روزی تو قسم ہے فاقہ مستی کی
کرم سے اُسکے جاری آب و دانہ ہوگیا ہوتا

یہ دل فولاد ہے، پر جذب کرلیتا ہے تیروں کو
و گرنہ پھینکنے والا نشانہ ہوگیا ہوتا !

خرد مجھ کو عطا کر کے مُقیّد کرلیا ورنہ
جنوں ہی میری بخشش کا بہانہ ہوگیا ہوتا

ابھی تک سلسلہ باقی ہے ذکر یار کا دل میں
و گرنہ بھول کر اُس کو زمانہ ہوگیا ہوتا

نہ ہوتی کار فرما گر مشیت آپکی عالم میں
کبھی کا ڈھیر سارا کارخانہ ہوگیا ہوتا

عزیزؔ اب تک ہے میرے دل کے گوشے میں یہی حسرت
بلاتا پھر کوئی مجھکو، روانہ ہوگیا ہوتا

ہوتا نہیں اُجالا نورِ سحر سے پہلے
رختِ سفر نہ باندھو وقتِ سفر سے پہلے

کیسی ہے اپنی بستی یہ بعد میں سمجھنا
واقف تو آپ ہولیں خود اپنے گھر سے پہلے

سائے کی اہمیت اب اِس درجہ بڑھ گئی ہے
سب چھت بنا رہے ہیں دیوار و در سے پہلے

وجہہِ بقائے صُبحِ جمہوریت کی خاطر
اسبابِ خیر دیدو سامانِ شر سے پہلے

دل بستگی کو میری آئے ہوئے ہو، مانا
پر خیریت تو پوچھو اس چشمِ تر سے پہلے

اِس مرگ ناگہاں سے، ہم بے خبر نہیں تھے
محسوس کرلیا تھا یہ دل نظر سے پہلے

دیکھو عزیزؔ تم کو، تکتے ہیں سب مناظر
شائد گذر چکے ہو اس رہ گذر سے پہلے

جس دن سے کناروں نے پانی میں اُچھالا ہے
طوفاں نے جگہ دی ہے، موجوں نے سنبھالا ہے

موجوں کو اُلجھنے کا موقع نہ دیا ہم نے
اس طرح سفینے کو طوفاں سے نکالا ہے

مشکل تھا قدم رکھنا اِس ریت کی دنیا میں
پوچھو نہ توازن کو کس طرح سنبھالا ہے

مانگی نہ ضیا ہم نے غیروں کے چراغوں سے
مانگے کا اُجالا بھی کہئیے کہ اُجالا ہے ؟ !

پائی نہ محبت کی ہلکی سے حرارت بھی
ہر آنکھ کو پرکھا ہے، ہر دل کو کھنگالا ہے

ٹکراؤ ہے ندیوں کا، ہر روز کا سنگم ہے
گنگ و جمن ہیں آنکھیں، دل اپنا ہمالا ہے

دنیا میں کمی کیا ہے، دل توڑنے والوں کی
لیکن اَے عزیز اُسکا انداز نرالا ہے

یوں اپنے آپ کو خطرات میں ہم خود ہی لا بیٹھے
جہاں شب خون کا ڈر تھا وہیں خیمہ لگا بیٹھے

کبھی ہنس کر گذاری ہیں چٹانوں میں سیہ راتیں
کبھی پیپل کی ٹھنڈی چھاؤں میں گھبرا کے آبیٹھے

کبھی ہم تھک کے بیٹھے ہیں کسی بے جان مورت سے
کبھی دوڑے ہیں اتنا کہ ہواؤں کو تھکا بیٹھے

کبھی راتوں کے سناٹے میں دل سے بات کرتے ہیں
کبھی ہم دن کے شور وغل میں خود کو بھی بُھلا بیٹھے

گذر جاتے ہیں دن تو پھر پلٹ کر آ نہیں سکتے
تصور میں مگر اُن کو عقیدت سے سجا بیٹھے

ستائیں جب کبھی یادیں ہمیں بیتے ہوئے پل کی
سُنائی داستاں دل کو، ان آنکھوں کو رُلا بیٹھے

ہمیں دانا سمجھ کر یہ زمانہ دور جا بیٹھا
مسائل ہم کو دیوانہ سمجھ کر پاس آ بیٹھے

عزیزؔ ہم سر پھرے لوگوں کی دنیا ہی نرالی ہے
جہاں دل آگیا اپنا وہیں پر دل لگا بیٹھے

یہ چڑھتی دھوپ نے دیکھا کہاں ہے
کہاں دیوار ہے سایہ کہاں ہے

اُجالے بانٹتا ہے دِن میں سورج
مگر یہ رات کو رہتا کہاں ہے

در و دیوار ہی سے گھر نہیں ہے
یہ گھر والوں کو اندازہ کہاں ہے

یہ مانا خون کے رشتے ہیں سارے
بتاؤ درد کا رشتہ کہاں ہے

صراحی، جام و ساقی، میکدہ ہے
مگر وہ ذوقِ رندانہ کہاں ہے

بدلتے موسموں کا ہے یہ موسم
کہ ہر دن ایک سا رہتا کہاں ہے

پتہ منزل کا سب کو دینے والا
کسی کو راستہ دیتا کہاں ہے

غنیمت ہے یہ مُہلت چار دن کی
پھر اُسکے بعد یہ موقع کہاں ہے

مُسافر ہیں سبھی اَندھے سفر کے
کسے معلوم ہے جانا کہاں ہے

مشینیں دوڑتی ہیں ہر سڑک پر
کسی کا نقشِ پا ملتا کہاں ہے

پھروگے آئینہ لیکر یوں کب تک
عزیزؔ اب دیکھنے والا کہاں ہے

غم کا سایہ اوج پر آیا شبِ تاریک میں
بن کے میرا راہ بر آیا شبِ تاریک میں

کرسکا نہ شوق جس کو روشنی میں دِن تمام
ذوق ایسا کام کر آیا شبِ تاریک میں

تم سُلگنے کا یہ فن سیکھے ہو دِن کی دھوپ میں
ہم کو جلنے کا ہُنر آیا شبِ تاریک میں

جو گیا تھا روزِ روشن سے اُجالا مانگنے
لوٹ کر وہ اپنے گھر آیا شبِ تاریک میں

زندگی سے کھیلتے رہنا تھا جس کا مشغلہ
تھک کے وہ بھی بام پر آیا شبِ تاریک میں

دن کے ہنگاموں میں تھا اِک جوش کا عالم مگر
ہوش کا پہلو نظر آیا شبِ تاریک میں

دن چڑھے تک نیند کے عالم میں ہم مدہوش تھے
ہوش تو آیا ، مگر آیا شبِ تاریک میں

گر رہے تھے میرے دامن میں ستارے ٹوٹ کر
میرا دل کچھ ایسا بھر آیا شبِ تاریک میں

فکر یہ ہے ، کیا خبر لایا خدا جانے عزیزؔ
خط کو لیکر نامہ بر آیا شبِ تاریک میں

ناز و نیاز دھوپ کے سر پر اٹھایئے
لیکن نہ آسماں کی طرف سر اٹھایئے
سر پر یہ آسمان اٹھائے تو کیا ہوا
اس کا علاج یہ تو نہیں گھر اٹھایئے !
محلوں کے خواب ڈھیر ہوئے ، آنکھ کھل گئی
دن چڑھ چکا ہے اب تو یہ بستر اٹھایئے !
مدت سے آرزو تھی تمھیں دولتِ غم کی
پلکوں پہ آگرے ہیں یہ گوہر اٹھایئے
فطرت یہ ٹوکتی ہے کہ رہنا ہے سر نگوں
حالات کہہ رہے ہیں میاں سر اٹھایئے
بلوائی در پہ آکے کھڑے ہیں حضور کے
قرطاس و قلم پھینک کے خنجر اٹھایئے
درپردہ سازشی ہیں کئی قتلِ عام کے
انگلی ، سوال یہ ہے کہ کس پر اٹھایئے ؟
پتھر پڑے ہوئے ہیں یہاں کاغذات پر
یکسر نمائشی ہے یہ دفتر اٹھایئے
ظلمت کدے میں دھوپ کی کرنیں بھی بجھ گئیں
اس حال میں نہ مِنت اختر اٹھایئے
اوروں کی کشتیاں تو بہت دور جا چکیں
اب ہوش آگیا ہے تو لنگر اٹھایئے
مجنوں ہمارے وقت کا ابلیس ہے عزیزؔ
پتھر نہ اس پہ ماریئے کنکر اٹھایئے

چوٹ کھانا ، مسکرانا دل جگر کا کام ہے
حق کے آگے اُف نہ کرنا ہی بشر کا کام ہے
چھوٹنا ، گرنا ، تڑخ جانا ہے شیشے کی صفت
جوڑنا ، اس کو بنانا شیشہ گر کا کام ہے
تو اسے کعبہ بنا ، کاشی بنا کہ دل بنا
یہ مرے گھر کا نہیں ہے، تیرے گھر کا کام ہے
رونے والوں کو ہنسانا درد مندوں کا ہے کام
آپ اپنے اشک پینا چشمِ تر کا کام ہے
مشورہ مانے نہ مانے یہ مسافر کی خوشی
ہر قدم پر راہ دکھلانا خضر کا کام ہے
ہر قدم اس کے قدم سے میں ملاتا ہوں مگر
اب مرے ہمراہ چلنا ہمسفر کا کام ہے
مطمئن میں ہو چکا ہوں اس کو بے دیکھے عزیزؔ
دیکھ کر ایمان لانا کم نظر کا کام ہے

سعودی عرب سے لوٹنے کے بعد پیش آئے تجربات پر ۔۔۔ ایک تاثر
(۱۹۸۸ء)

جب سفر سے لوٹ کر ہم گھر چلے تو کیا نہ تھا
جو گھروندہ ہم نے مٹّی کا بنایا تھا نہ تھا
شہر کے منظر بھی تھے کچھ اِس طرح بدلے ہوئے
جیسے نظروں نے اُنہیں پہلے کبھی دیکھا نہ تھا
تھا یقیں ہر شئے کی حالت کے تغیّر کا مگر
یوں زمانے کے بدل جانے کا اندازہ نہ تھا
سرد مہری ، تیکھے تیور ، ہر نظر بدلی ہوئی
نفرتیں ہی نفرتیں تھیں پیار کا جذبہ نہ تھا
مجھ سے اکثر کہہ رہی تھی میرے اپنوں کی نظر
میں وہی تھا پر مِرا چہرہ ، مرا چہرہ نہ تھا
لے لیا چپ چاپ ہنس کر سر پہ ہر الزام کو
کچھ صفائی میں کہیں ایسا کوئی موقع نہ تھا
سادہ لوحی پر مری تنقید کی بوچھار تھی
اور زمانے کی سیاست کا کوئی چرچا نہ تھا
یوں بھی تنہائی ہمیشہ ساتھ رہتی ہے ، مگر
اس سے پہلے تو کبھی میں اس قدر تنہا نہ تھا
میں نے چاہا تھا چٹانوں میں گذاروں زندگی
آشیانہ ہو چمن میں یہ کبھی سوچا نہ تھا
ہم تو ماضی کے جھروکوں میں سدا کھوئے رہے
کیا کریں کہ ہم پہ فردا کا دریچہ وا نہ تھا
تھا جو سرمایہ کبھی سودا نہ تھا سر میں عزیز
اور کبھی سودا جو تھا تو پاس سرمایہ نہ تھا

فطرتی غم آج مصنوعی خوشی میں غرق ہے
کرب میں ڈوبا ہوا چہرہ ہنسی میں غرق ہے

روزنوں سے جھانکتی ہے تیرگی ہی تیرگی
رونقِ محفل بظاہر روشنی میں غرق ہے

برف میں ڈوبی ہوئی سر سبز وادی یوں لگے
عالم احساس جیسے بے حسی میں غرق ہے

گونگا ساحل چیختی موجوں سے آخر کیا کہے
اب سمندر خود ہی بحرِ خامشی میں غرق ہے

جوش عالمگیر بھی ہے ، ہوش دامنگیر بھی
یوں خرد اہلِ جہاں کی بے بسی میں غرق ہے

حُسنِ فطرت پر یہ دھندلا پن کہاں سے آگیا
جو بھی منظر ہے یہاں آلودگی میں غرق ہے

حال کا غم ، فکر فردا ، ذکر ماضی الاماں
اک تلاطم سا مزاج آدمی میں غرق ہے

جاگتی آنکھوں میں یہ سوئی ہوئی دنیا عزیزؔ
ایسا لگتا ہے سرابِ آگہی میں غرق ہے

یہ ساحل کے تماشائی نگہبانوں میں رہتے ہیں
خبر اُن کی نہیں رکھتے جو طوفانوں میں رہتے ہیں

سیانہ پن یہی ہے ۔ سیانوں میں نہ مِل بیٹھیں
وہی دانا ہیں دنیا میں جو دیوانوں میں رہتے ہیں

چمن میں رہنے والے ہی چمن کا خُون پیتے ہیں
مگر جو خون دیتے ہیں وہ ویرانوں میں رہتے ہیں

یہ شیشے کے مکانوں سے چمن کی خاک اچھی ہے
وہ گل ہی کیا چمن والو جو گلدانوں میں رہتے ہیں

شہر میں رہ کے یہ کہتے ہو دنیا دیکھ لی ہم نے !
جہاں دیدہ تو وہ ہیں جو بیابانوں میں رہتے ہیں

نہ ہم کو یوں اُچھالو تم ، ذرا پرکھو ، ذرا سمجھو
وہ سکے تو نہیں ہیں ہم ، جو نذرانوں میں رہتے ہیں

جنہیں پوجیں تو مجرم ہوں ۔ نہ پوجیں تو مخالف ہوں
عزیزؔ ایسے صنم ہی اب صنم خانوں میں رہتے ہیں

دن نکلتے ہی سنور جاتا ہے — شام کے ساتھ ہی مر جاتا ہے

کاش پرواز کی طاقت مل جائے — راستے بند ہیں ، گھر جانا ہے

اپنے ہمراہ سمندر لیکر — ایک سیپی میں اُتر جانا ہے

کب سے اسباب لئے ٹھہرے ہیں — کچھ تو کہئیے کہ کدھر جانا ہے

چھوڑدو کشتیوں کو ساحل پر — سوئے گرداب اگر جانا ہے

پھول کی طرح سمٹنے کو عزیزؔ
گرد کی طرح بکھر جانا ہے

اُڑ کے ذرے خاک کے اس انجمن تک آگئے — جنکا قد دو ہاتھ کا تھا وہ گگن تک آگئے

موزیوں کا دشت وصحرا سے جو دل اکتا گیا — دل کے بہلانے کو وہ ارضِ چمن تک آگئے

ہم کہ تن آساں تھے پرائے گردشِ لیل ونہار — جستجو کی دوڑ میں دار و رسن تک آگئے

پھیلتا ہی جارہا ہے اجنبیت کا حصار — اس کے باہر کب ہوئے ہم تو وطن تک آگئے

بلبلا سا دل ہے لیکن اُس کو ڈھانا ہے محال — اپنا سا منہ لیکے واپس کوہ کن تک آگئے

بلبل و گل کے چلن کو دیکھ کر کانٹے سبھی — رونگٹوں کی شکل میں میرے بدن تک آگئے

جن کو گودی میں کھلایا تھا وہی بچے عزیزؔ
مجھ سے اونچے ہوگئے بزمِ سخن تک آگئے

کوئی ہرگز نہ یہ سمجھے کہ انجانے میں آبیٹھے
چمن میں دل جو گھبرایا تو ویرانے میں آبیٹھے

شریفوں نے تو قبضہ کرلیا ہے ساری بستی پر
ہوئے کچھ ایسے ہم رُسوا کہ میخانے میں آبیٹھے

اُنہیں پی کر بھلانے کی ابھی تدبیر سوچی تھی
اُتر کر میری آنکھوں سے وہ پیمانے میں آبیٹھے

زمانے میں جو بدلا طور پوری آستینوں کا
تو سارے آستیں کے سانپ دستانے میں آبیٹھے

نہ تھی ہرگز نہ تھی ہم کو توقع سرد مہری کی
فریبِ دوستی میں ہم تو یارانے میں آبیٹھے

جُنونِ سادگی نے کردیا شطرنج کا مہرہ
کہاں رہنا تھا ہم کو اور کس خانے میں آبیٹھے

نہ تھی شائد کہیں منزل زمانے کے مسائل کی
ہوئی جب رات تو سب میرے کاشانے میں آبیٹھے

اُنہیں دیر و حرم میں ڈھونڈتے پھرتے تھے ہم کب سے
ترس آیا تو وہ تسبیح کے دانے میں آبیٹھے

بہت ضدی ہے دل ، اپنا پرایا کچھ نہیں جانے
نہ آنا تھا عزیز اس دل کے بہکانے میں آبیٹھے

اُلجھن کو اور بھی کچھ اُلجھا گئی ہیں آنکھیں
ماحول کی گھٹن سے اُکتا گئی ہیں آنکھیں

دنیا کے دیکھنے کو درکار ہے بصیرت
لیکن بصارتوں سے شرما گئی ہیں آنکھیں

اب رات ہوچکی ہے پلکوں کو مُوند لیجے
وقتِ سحر یہ ہم کو سمجھا گئی ہیں آنکھیں

کچھ اور ہی خبر تھی ، منظر کچھ اور ہی تھا
ہر راز زندگی کا بتلاگئی ہیں آنکھیں

کانوں میں چُبھ رہی ہے سکّوں کی کھنکھناہٹ
آسودگی کے غم میں مُرجھاگئی ہیں آنکھیں

کل کے خریدنے کو ہم آج بیچ آئے
آنکھوں پہ کیسا چشمہ لگواگئی ہیں آنکھیں

فکرِ جدید کو ہے اِمروز کی تمنّا
فردا کے خوف سے یوں پتھراگئی ہیں آنکھیں

ہر اِک غُبارِ غم سے ہوں پاک ، اِس غرض سے
پلکوں کو آنسوؤں سے نہلاگئی ہیں آنکھیں

فطرت کے آئینے میں انسان کا یہ چہرہ
نظروں میں جب سے آیا شرما گئی ہیں آنکھیں

اِسکا گُماں نہیں تھا لیکن ،عزیزؔ پھر بھی
دنیا کو ایسا منظر دکھلا گئی ہیں آنکھیں

ہے مرا گھر بار میں بے گھر نہیں
دیکھنے والا کوئی گھر پر نہیں

جو بھی منظر ہے مقابل ہے مرے
کوئی منظر اب پس منظر نہیں

نفس اور دل کے مخالف جنگ ہے
اِس لڑائی میں کوئی لشکر نہیں

میں نے لوٹا دی امانت جو بھی تھی
بوجھ کوئی اب مرے دل میں پر نہیں

اس محبت کے نشے میں چور ہوں
جس محبت کا کوئی پیکر نہیں

سامنے آکر ملا مجھ سے نظر
وار کر مجھ پر ، مگر چھپ کر نہیں

کتنی پرتوں میں بٹا ہے دل ترا
بات جو اُوپر ہے وہ اندر نہیں

وقت کی یہ دھڑکنیں ہیں تیز گام
پر ہماری سانس سے بڑھ کر نہیں

خوب ہے صحرا نوردی اَۓ عزیز
دشت میں پھر شوق سے ، در در نہیں

بھولنے والے نہ تڑپاتا تو کیا جاتا ترا
حافظہ بھی چھین لے جاتا تو کیا جاتا ترا

دل سے دل اور ذہن سے ہے ذہن کا گر رابطہ
یاد آتے ہی چلا آتا تو کیا جاتا ترا

بڑھ گیا ترکِ تعلّق سے تعلّق اور بھی
اِس تعلّق سے بھی کٹ جاتا تو کیا جاتا ترا

کوششیں تجھ کو بُھلانے کی سب اُلٹی ہو گئیں
یہ اَذِیت کیوں ہے سمجھاتا تو کیا جاتا ترا

کون سا رِشتہ ہے یوں بھی دائمی اَئے بے وفا
تو حقیقت پر اُتر آتا تو کیا جاتا ترا

اب کوئی منظر نہیں ایسا کہ جس میں تو نہیں
تو ہی ہر منظر سے ہٹ جاتا تو کیا جاتا ترا

دائرہ میری بصارت کا بہت محدود ہے
دائرے میں تو بھی آجاتا تو کیا جاتا ترا

میں رگِ جاں میں کہاں ڈھونڈوں تجھے تو ہی بتا
حوصلہ اتنا جگا جاتا تو کیا جاتا ترا

ظاہری آنکھوں سے میں باطن کو دیکھوں کس طرح
دل کی آنکھیں کھول کر جاتا تو کیا جاتا ترا

آئینہ تیرا ، تری صورت ، ترا جلوہ ، مگر
کون ہوں میں اتنا بتلاتا تو کیا جاتا ترا

دِل کے گوشے گوشے میں ہے تُو ہی تُو لیکن عزیزؔ
مجھ کو آنکھوں سے نظر آتا تو کیا جاتا ترا

کچھ کہا میں نے تو دنیا نے مرا بچپن کہا
چپ رہا تو میری خاموشی کو گونگا پن کہا

الجھنوں کو میں نے سلجھانے کی جب بھی بات کی
اس نے میرے مشورے کو اک نئی اُلجھن کہا

اس مکاں کو چار دیواروں سے کیا بانٹا گیا
چار دیواری کو سب نے اپنا گھر آنگن کہا

بند رہ کر دریچہ دیکھ سکتا ہے اگر
کیا غلط میں نے کہا تھا گر اُسے چلمن کہا

آگ برسے یا کہ پانی کچھ تو برسا اس برس
آگ ہی برسی تو میں نے دھوپ کا ساون کہا

مانگ اِسکی بھر رہے ہیں لوگ سب بارود سے
شاعروں نے جس جہاں کو چاند سی دلہن کہا

اس سے اَن بن کا سبب تھی اِک غلط فہمی عزیزؔ
اُس نے "میلاتن" سنا جو میں نے "اُجلا من" کہا

آپ کے واسطے انا سب کچھ
میرے حق میں مرا خُدا سب کچھ

آنکھ میں آکے اشک کا قطرہ
کہہ گیا دل کا ماجرا سب کچھ

تھا سلیقہ نہ جس کو دینے کا
اُسکے ہاتھوں میں دے دیا سب کچھ

رات کیا کیا نہ خواب دیکھے تھے
دن جو نکلا تو کیا ہوا سب کچھ

میرا کچھ بھی نہیں ہے دنیا میں
آپ کا صرف آپ کا سب کچھ

سن کے دیوار چپ رہی لیکن
کہہ چکا ہم سے آئینہ سب کچھ

رہ گئے تم عزیزؔ ساحل پر
بہتے پانی میں بہہ گیا سب کچھ

٦ / ڈسمبر ۱۹۹۲ء کے فسادات کے پس منظر میں........

زباں ہو مُشتعل تو سرد یہ حالات کیا ہونگے
نہ سُلگاؤ ، کہ پھر خاموش یہ جذبات کیا ہونگے
سزا نا کردہ جُرموں کی بُھگتتے آرہے ہیں ہم
خدا جانے کہ مُستقبل میں الزامات کیا ہونگے
خطا کانٹوں کی تھی اور تُو سزا پھولوں کو دیتا ہے
یہ سوچ اَے باغباں کلیوں کے اِحساسات کیا ہونگے
ہمیں پر گر رہی ہیں آج اپنے گھر کی دیواریں
یہ ڈر اپنوں سے ہے تو غیر سے خدشات کیا ہونگے
نگر کا ڈوب جانا اور کھڑی فصلوں کا بہہ جانا
سِتم اِس سے سوا اَے موسمِ برسات کیا ہونگے
غریبی ، تنگدستی پر فسادوں کا اثاثہ ہے
یہ عطئیے مِل چکے ، اب یہ کہو سوغات کیا ہونگے
رنگے ہیں خونِ ناحق سے وہ اپنے ہاتھ اور دامن
یہ فطرت وحشیوں کی ہے تو پھر بد ذات کیا ہونگے
عزیزؔ اِس دور کے خونخوار پنجوں سے جو بچ نکلیں
وہ سب دیکھیں گے کل پر آج کے اثرات کیا ہونگے

آگیا گِرداب میں آخر سفینہ اِن دنوں
اور ہی لگتا ہے طوفاں کا اِرادہ اِن دنوں

اُڑتی حسرت ، بہتا پیسہ ، دوڑتی پھرتی ہوس
کیوں ہوا سے بات کرتی ہے یہ دُنیا اِن دِنوں

وقت کے پنکھوں پہ دیکھو اُڑ رہے ہیں آپ ، ہم
دو قدم چلنا بھی ہے کس کو گوارا اِن دنوں

آپ اپنے سائے سے چونکا ہوا ہے آدمی
موت کا سایہ ہے جیسے اُس کا سایہ اِن دنوں

جس قدر اُونچی اُٹھائی جاتی ہے گھر کی فصیل
اُس قدر اُٹھتا ہی جاتا ہے بھروسہ اِن دنوں

اب لب و لہجہ بتادیتا ہے دل کی بات کو
حاجتیں جیسی ہیں بس ویسا ہے لہجہ ان دنوں

آج کا دن کٹ رہا ہے خیر سے لیکن عزیز
آج سے بڑھ کر ہے دل کو کل کا خدشہ اِن دنوں

آج خطرے میں نظر آتے ہیں آثارِ چمن
شاخِ گل سوکھی ہوئی ہے نم ہے دیوارِ چمن

چار سو پھیلا ہوا ہے نفرتوں کا خارزار
آبلہ پا پھر رہا ہے بن میں بیمارِ چمن

پھول خود اپنی ہی خوشبو سے ہراسانی میں ہیں
رفتہ رفتہ ہو رہے ہیں فاش اسرارِ چمن

غنچۂ خوش رنگ میں پہلی سی رعنائی کہاں
گھٹ چکے ہیں آبِ مصنوعی سے اقدارِ چمن

پتہ پتہ، ڈالی ڈالی کیڑ کے قبضے میں ہے
زہر کا چھڑکاؤ کرتے ہیں وفادارِ چمن

پھول، غنچے، نرم ہریالی، طیورِ خوش نوا
حُسنِ فطرت ہے انہیں سے ان سے دربارِ چمن

فطرت گلشن بھی بدلی موسموں کے ساتھ ساتھ
اس تغیر سے بھی ہے آگاہ معمارِ چمن

پھول کی پہچان ہے نہ جس کو خوشبو کی پرکھ
بن گیا وہ اپنی قسمت سے خریدارِ چمن

اس کے دل میں ڈر نہیں رہتا اُجڑنے کا عزیزؔ
لگ رہا ہے اپنا ویرانہ ہی حقدارِ چمن

اپنی تہذیب کی تصویر جلادی تو نے
راکھ دریا میں محبت کی بہادی تو نے

خونِ اسلاف سے تعمیر ہوئی تھی جس کی
ایک ٹھوکر میں وہ دیوار گرادی تو نے

رنج اس کا تو نہیں ہے کہ تیرے قبضے میں
دولتِ لوح و قلم تھی جو لُٹادی تو نے

کیا کہوں، دل کی عمارت کو سنبھالا کیسے
جب مرے صبر کی بنیاد ہلادی تو نے

بجھ سکے گی نہ کبھی شمع محبت تجھ سے
ہم نے مانا کہ ہواؤں کو ہوا دی تو نے

یاد کرنا ہے خطا، تجھ کو بُھلانا دو بھر
چاہنے والوں کو کیا خوب سزا دی تو نے

جذبۂ شوق میں لکھا تھا جسے ساحل پر
آج وہ ریت کی تحریر مٹادی تو نے

خانۂ دل میں ہے محفوظ محبّت اے عزیزؔ
نفرتوں کو تو نگاہوں میں جگہ دی تو نے

شکاری اپنی کوتاہی پہ پچھتایا تو کیا حاصل
شکستہ جال میں شہباز بھی آیا تو کیا حاصل
کڑی محنت پہ پانی پھیرتی ہے بھول چھوٹی سی
ذرا سا ہی سہی شیشے میں بال آیا تو کیا حاصل
ضروری ہے کسی گتھّی کا سلجھانا ضرورت پر
وہ ساعت بیتنے پر حل نکل آیا تو کیا حاصل
توقّع پر وہ جس نے دھوپ سہہ لی تھی مسافت کی
سرِ منزل اُسے اشکوں سے نہلایا تو کیا حاصل
سلگتی کھیتیاں تو یوں بھی بارش کو ترستی تھیں
اُنہیں پرائے فلک تو قہر برسایا تو کیا حاصل
دلِ ناداں نہ ہو مسرور یوں حسرت نکلنے پر
جسے کھونا یقینی ہے اُسے پایا تو کیا حاصل
مناسب ہے اُسی کا ساتھ جو قد کے برابر ہو
جو سائے سے بڑا کوئی ہمسایہ تو کیا حاصل
جسے کھلنا نہیں آتا اسے غنچہ نہیں کہتے
چٹخنا کام تھا اس کا وہ مرجھایا تو کیا حاصل
ہمیں اس خوش گمانی سے تسلی ہو نہیں سکتی
جو خود آتا نہیں وہ یاد بھی آیا تو کیا حاصل
عزیز ہم جس کو بھولے تھے متاعِ حافظہ دے کر
اُسی کے ذکر کو پھر تم نے دہرایا تو کیا حاصل

وقت ہی کا کھیل ہے جس نے دیا ہے بَل اُنہیں
یہ بَلا کیا چیز ہے معلوم ہو کَل اُنہیں

کِتنے دانشور نہ جانے اُن سے سیکھے ہیں سبق
سوچ کر اَئے بے خبر کہنا ذرا پاگل اُنہیں

پُھول تھے جن کے مقدّر میں وہ سب مُرجھا گئے
جن کی قِسمت میں تھے پتّھر مل گئے سب پھل اُنہیں

جتنی اُونچائی پہ اُڑنے کی تمنّا دِل میں ہے
اُتنی گہرائی میں لے جائیگا یہ دلدل اُنہیں

رینگتے کیڑے بھی پہنچے ہیں سرِ شاخِ ثمر
اَئے ہوا دنیا ذرا اب دعوتِ ہلچل اُنہیں

جن کے دِل میں تھی مہکتی منزلوں کی آرزو
خار زاروں میں سدا چلنا پڑا پیدل اُنہیں

تھا بہت کانٹوں کو اپنی بدنمائی کا ملال
اِس لیے قدرت نے بخشا پُھول کا آنچل اُنہیں

کیسا بٹوارہ کیا ہے اب کے ساون کیا کہیں
تیر کی تلخی ہمیں اور جون کا جل تھل اُنہیں

شہر میں آکر بھی رُسوائی کا شِکوہ ہے عزیزؔ
راس کیوں آتا نہیں آخر کوئی جنگل اُنہیں

وقت کے سیلاب میں بہتا ہوا دریا رہا
اُس کو کیا معلوم کہ کیا بہہ گیا اور کیا رہا

خوف کی سولی پہ ہے سارا جہاں لٹکا ہوا
تلخی حالات سے ہم سب کا سمجھوتا رہا

ہوگئی ہر ایک فریادی کی بینائی بحال
اس قدر قانون اپنے وقت کا اندھا رہا

آدمیت بے لباسی پر سدا روتی رہی
اُسکی چادر اُوڑھ کر میں سرخرو ہوتا رہا

میں نہ کہتا تھا نہ کر اب تو کسی کا اعتبار
دیکھ تو اس انجمن میں آج بھی تنہا رہا

دیکھنا سارا سمندر آنکھ سے بہہ جائیگا
گر سر مژگاں لرزتا ایک بھی قطرہ رہا

دل ہمارا سارے اندیشوں کا مرکز ہے عزیز
پھر بھی تنہا کار راز زیست میں لڑتا رہا

زندگی تجھ سے بڑا دلدل نہیں دیکھا کوئی
وہ پہیلی تو ہے جس کا حل نہیں دیکھا کوئی

جس کو مستقبل سمجھتے ہیں وہ بس اِک خواب ہے
آج کا دن سب نے دیکھا ، کل نہیں دیکھا کوئی

جو سما جاتے ہیں بینائی کی مانند آنکھ میں
اُنکو آنکھوں سے کبھی اوجھل نہیں دیکھا کوئی

ڈال دیتے ہیں فسردہ رُخ پہ خوشیوں کا نقاب
بے کلی میں بھی۔ ہمیں بے کل نہیں دیکھا کوئی

آدمیوں سے ، گھروں سے بھر گیا سارا شہر
سچ ہے کہ اتنا بڑا جنگل نہیں دیکھا کوئی

باغ میں اونچے درختوں کی نہیں کوئی کمی
بس یہ رونا ہے کہ ان میں پہ پھل نہیں دیکھا کوئی

تو نصیحت سے کبھی نہ باز آئیگا عزیزؔ
تیرے جیسا دہر میں پاگل نہیں دیکھا کوئی

رہبر کسی کا ہے نہ ہی رستہ چلے چلو
منزل کی جستجو ہو تو تنہا چلے چلو

ہوتی ہے رہبروں کی تو اندھوں کو ضرورت
تم کو مِلا ہے دیدۂ بینا چلے چلو

رُک جاؤ دیکھتے ہی سیاہ رات کے نشاں
ہوتے ہی صبح نور کا تڑکا چلے چلو

رُکنا ہو تو رُک جاؤ کسی پیڑ کی طرح
چلنا ہو تو بصورتِ دریا چلے چلو

رُکنے سے احتمالِ وجودِ سکوت ہے
بے وقت کا رُکنا بھی ہے بے جا چلے چلو

کہتی ہے کیا یہ تم سے سنو گردشِ سفر
ہے زندگی کا نام ہی چلنا چلے چلو

غیروں کی بات میں تو نہیں کوئی بل عزیزؔ
کر کے خود اپنے بل پہ بھروسہ چلے چلو

نہ چھیڑ اس حال میں بادِ خزاں قصّے تو گلشن کے
نہ موسم ہے بہاروں کا نہ دن ہیں اب وہ بچپن کے

رفو سازی سے واقف ہو نہ گُر معلوم سیون کے
گریباں چاک کیجے آپ تو ماہر ہیں اِس فن کے

یہ بے فِکری، مری خانہ بدوشی ہی غنیمت ہے
نہ بجلی کا یہ ڈر اچھا نہ اندیشے نشیمن کے

خوشامد سے تو پہلے کام سب بنتے تھے، لیکن اب
وہیں پر بات بنتی ہے جہاں سِکّہ زرا کھنکے

اگر ہو سائباں سر پر مُصیبت ٹل نہیں سکتی
ہمارے سر پہ گھر کی چھت ہے اُس پر پیڑ آنگن کے

نظر آتے نہیں لیکن وہ سب کو دیکھ لیتے ہیں
یہ پردے کی حقیقت ہے، یہ ہیں اسرار چلمن کے

تسلّی چاہیئے تو شعر میرے غور سے پڑھیئے
مرے اشعار میں مِل گے سب راز اُلجھن کے

عزیزؔ اب خوشہ چینوں کی قطاریں ہی قطاریں ہیں
ذرا دیکھو تو اِن میں کتنے رکھوالے ہیں خرمن کے

ہم کو مئے سے کوئی مطلب ہے نہ میخانے سے
کھیلتے رہتے ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانے سے

ہاتھ رکھدے نہ کہیں دُکھتی رگوں پر اپنا
اس لیئے دُور رہا کرتے ہیں دیوانے سے

پھل جو بے خوف تھے پتوں میں چھپا کر خود کو
گر گئے شاخ کی نظروں میں کھٹک جانے سے

پیڑ اب جھوم کے سنتے ہیں ترنّم اُن کا
کون روکے گا ہواؤں کو غزل گانے سے

یہ بھی اک رمزِ حقیقت ہے اسے کیا کہیئے
جتنے کردار ہیں منسوب ہیں افسانے سے

جا چکا سانپ نہ پیٹو یوں لکیر اب اُسکی
لوٹ کر وقت نہیں آیگا پچھتانے سے

دھوپ کیا چیز ہے محسوس ہُوا اب ہم کو
اک ذرا نیم کے سائے میں ٹھہر جانے سے

ہے تری خاک کا سُرمہ مری آنکھوں میں عزیز
یہ صبا کہتی ہے ہر صبح کو پروانے سے

جس شہر کی خاک تھے چھانے ہوئے
کیوں اُسی کے لوگ بیگانے ہوئے

نامناسب تھا محبّت کا چلن
جن کو اپنایا وہ انجانے ہوئے

ہم کو چونکایا بہت اچھّا کیا
ہم تو تھے کچھ اور ہی جانے ہوئے

جال پھیلائے ہوئے ہیں راہ زن
قافلے منزل کی ہیں ٹھانے ہوئے

ساری مستی ہے ہماری ، آپ کی
مفت میں بدنام میخانے ہوئے

شمع کو محسوس تک نہ ہوسکا
اِس طرح خاموش پروانے ہوئے

جنّؔن احباب ، انجانے عزیز
سب کے سب ہیں جانے پہچانے ہوئے

نہ اپنی سُدھ ہے نہ دنیا کا ہے خیال مجھے
" سُنا رہا ہے کوئی مژدۂ وصال مجھے "

جہاں سے پست نظر آئے کوئی بامِ عُروج
اب اُس اُڑان پہ پہنچا گیا زوال مجھے

خبر کسی کو نہ ہو، مجھ کو بھی ملال نہ ہو
نکالنا ہو تو محفل سے یوں نکال مجھے

یہ کِس مقام پہ لایا ہے مجھ کو میرا جُنوں
میں پُل صراط پہ ہوں اَے خرد سنبھال مجھے

زمیں پہ آج جو ٹپکا ہے پسینہ میرا
تسلّی دیتا ہے چھوٹا سا اِک رومال مجھے

مرے قریب سے ہو کر گذر گئی ہے قضاء
دُعائیں ماں کی بچالی ہیں بال بال مجھے

وہ لڑ رہا ہے زمانے سے میرے حق کیلئے
بچا کے خود کو نظر سے، بنا کے ڈھال مجھے

دیارِ غیر میں ہجرت ہے اِک عذاب عزیزؔ
اب ایک لمحہ بھی لگتا ہے ایک سال مجھے

تسلیوں کے شگفتہ گلاب رکھدینا
اِن اندھی آنکھوں میں اَن دیکھے خواب رکھدینا
فلک پہ اُڑنے سے نزدیک کب ہوئی دُنیا
قدم زمین پہ اپنی شتاب رکھدینا
کھلا تو رکھیئے ذرا ہاتھ کم سے کم اپنا
کٹھن اگر ہے کھلا دل کا باب رکھدینا
سلگ رہا ہے سمندر پہ وقت کا سورج
جو ہوسکے تو اِسے زیرِ آب رکھدینا
حبابِ زیست ہے جب کائنات پر حاوی
تو اس کا نام بھی اب آفتاب رکھدینا
نظر ہے حسن و زر و مالِ جہاں پر سب کی
اب اِس کے رُخ پہ خدایا نقاب رکھدینا
ازل سے ہی تو رہا ہے یہ شیوۂ آدم
حقیقتوں کے مقابل سراب رکھدینا
وجودِ دل کو کوئی جب جھنجھوڑ کر رکھدے
خدا کے حکم پہ اُسکا حساب رکھدینا
کرم نہیں ہے ترا یہ تو کیا ہے ، ہم سب پر
بقدرِ ظرف عذاب و ثواب رکھدینا
نظر بھی دنیا ان آنکھوں کو دید حق کیلئے
پھر اُس میں نُور حقیقت کی تاب رکھدینا
اُٹھا کے شانوں پہ پھرتے رہے ہو جس کو عزیز
زمیں پہ اب وہ جنازہ جناب رکھدینا

حوصلہ گردشِ ایّام سے برتر رکھنا
اک دیا چھوٹا سا طوفان کی زد پر رکھنا

سُوکھ جائے نہ زمیں دل کی یوں گھٹتے، گھٹتے
اپنے اشکوں کی نمی دے کر اِسے تر رکھنا

گُتھیاں اپنی لٹیں کھول کے رکھدیں خود ہی
یوں تدبّر کو نِگاہوں میں اُجاگر رکھنا

اِس اندھیرے کے تسلسل سے نہ پتھرا جائیں
بند آنکھوں کے مقابل کوئی منظر رکھنا

اک سُلگتے ہوئے سنگلاخ جزیرے کی طرح
"بوند آنکھوں میں نہیں دل میں سمندر رکھنا"

اپنی بستی میں ہیں ہر سمت مکاں شیشے کے
کتنا دُشوار ہے اب ہاتھ میں پتھر رکھنا

ہم نے مانا کہ یہ مقصد ہے ضروری، پھر بھی
آستینوں میں نہیں ہاتھ میں خنجر رکھنا

دل جہاں پر بھی جھکا چوٹ ہی کھائی اکثر
اب کسی در پہ یہ سر سوچ سمجھ کر رکھنا

دھوپ اور چھاؤں کے قبضے میں ہے دنیا ساری
گھر کی بنیاد کو ایسے میں کہاں پر رکھنا ؟

روشنی بانٹ کے بستی کے چراغوں میں عزیزؔ
گھر تو دنیا کے اندھیرے سے مُنوّر رکھنا

نظم دریا کا کسی جھیل پہ لادا نہ کریں
یہ دبستاں ہے یہاں شور مچایا نہ کریں

آپ حق پر ہی سہی شیخ کو ٹوکا نہ کریں
خود کو اس طرح زمانے میں اکیلا نہ کریں

مصلحت کہتی ہے خاموش رہیں اور دیکھیں
دل یہ کہتا ہے حقیقت کو چھپایا نہ کریں

خدمتِ خلق میں پنہاں ہیں مفادات کئی
رہ نما کیسے اسی شاخ پہ تکیہ نہ کریں ؟ !

بستیوں پر بھی سمندر کا تصرف ہے میاں !
گھر میں طوفاں ہے سمندر میں ٹھکانہ نہ کریں

تلخیاں پڑھ کے یہ سوئے ہیں زمانے بھر کی
اس طرح نیند سے بچوں کو جگایا نہ کریں

گھر کے افراد بھی پوچھیں نہ کہیں نام و پتہ
کھوئے کھوئے سے یوں دہلیز پہ ٹھہرا نہ کریں

اُڑ گیا وقت بھی ہاتھوں سے حنا کی مانند
ہتھیلی کی لکیروں کو کریدا نہ کریں

موتیاں رول کے ہر زخم کی رکھ لیں دل میں
شرط یہ بھی ہے کہ ساحل کو بھگویا نہ کریں

دھوپ ہی دھوپ ہے راہوں میں نہیں پیڑ عزیزؔ
اب کسی موڑ پہ رُکنے کا ارادہ نہ کریں

چرندوں کی نگاہوں میں خس وخاشاک ہے دنیا
مگر شاہیں کے حق میں منبعٔ افلاک ہے دنیا

مدبر کیلئے اک درس ہے فطرت کا ہر منظر
وسیع ہو گر نظر تو حاصلِ اِدراک ہے دنیا

کوئی گر دیکھنا چاہے اسے لیلےٰ کی نظروں سے
کسی مجنوں کے دامن کی طرح صد چاک ہے دنیا

مقامِ درس عبرت بھی ہے، عزت بھی ہے، شہرت بھی
دیارِ مُفلسی میں مسکنِ اِملاک ہے دنیا

تونگر کی نظر میں مخزن معدن ہے یہ لیکن
قلنّدر کیلئے بس ایک مُشت خاک ہے دنیا

تنِ ناپاک کی مانند ہے یہ بھی غلاظت میں
اگر دل پاک ہو تو آپ ہی خُود پاک ہے دنیا

اِسے ناقص سمجھنے کی جسارت کر نہیں سکتے
مقامِ حمد ہے، بزم شہہِ لولاک ہے دنیا

جو سمجھوگے سو پاؤگے جو بوؤگے سو کاٹوگے
عمل جیسا ہے پھل ویسا، بڑی بیباک ہے دنیا

عزیزؔ اہل وِفا کے واسطے یہ ماں کی صورت ہے
مگر سفاک لوگوں کیلئے سفّاک ہے دنیا

وقت یہ کہتا ہے کہ مجنوں کو ہی دانا کہو — ہوش کی جو بات کہتا ہے تو دیوانہ کہو

رند کہسیئے گا اُسی کو جس کا خالی جام ہو — مئے جہاں ملتی نہیں ہے اُس کو میخانہ کہو

میکدہ کس موڑ پر ہے اور ہے اب ساقی کہاں — کس کے آگے لیکے جاؤں اب یہ پیمانہ کہو

فصلِ گل میں بھی جہاں سب پھول ہوں بے رنگ و بو — اُس چمن کو بھی چمن کہتے ہو، ویرانہ کہو ؟ !

پیار کی خوشبو دلوں سے لے اُڑی رُت پیار کی — اب کوئی اپنا دِکھائی دے تو بیگانہ کہو

آندھیاں جب پھونک دیں گی بستیوں کی بستیاں — خاک کو بستر گذر گاہوں کو کاشانہ کہو

دستکیں دیتی ہیں کب سے خوف کی پرچھائیاں — کب سے اُنکا منتظر ہوں، شوق سے آنا کہو

یہ سسکتی آہ دل کی، یہ چھلکتے اشکِ غم — لینے والا کون ہے اب ایسا نذرانہ کہو

آگ میں جلنے کی حسرت ہو نہ ہو لیکن عزیزؔ
پر نکل آئے ہوں جس کے اُسکو پروانہ کہو

دِکھاوے کی یہ شہرت اور جھوٹی شان رہنے دے
جہاں حیرت کدہ ہے ، تو ہمیں حیران رہنے دے

کٹھن اِس دور میں ہے نیک و بد کا فرق سمجھانا
سمجھتے ہیں بہت کچھ پر ہمیں انجان رہنے دے

نفاذِ امن نہ تدبیر ہے اک سعئ لا حاصل
اگر بستی میں ہے برپا کوئی بحران رہنے دے

نہیں ہے کچھ اُمید چارہ سازی نیم جانوں سے
جو دل میں ہے ترے موجود وہ امکان رہنے دے

مشقت کی بہت اس دشت کو گلزار کرنے کی
یہ ویرانہ ہی تھی دنیا ، اسے ویران رہنے دے

جو کاہل ہیں اُنہیں اے وقت رہنے دے مکانوں میں
مگر ہم شہسواروں کو سرِ میدان رہنے دے

وجودِ گلستاں سے جو کبھی رشتہ نہیں رکھتے
سجا کر گھر میں رکھتے ہیں وہی گلدان ، رہنے دے

ہمیں جھوٹی تسلی دے کے بہلانے سے کیا حاصل
دلِ افسردہ خاطر میں جو ہیں ارمان رہنے دے

پڑا رہنے دے ہم کو اے عزیزؔ اب ساکت و صامت
رہا کرتا ہے گھر میں جس طرح سامان رہنے دے

زندگی صرف تری حسرت املاک میں ہے
کچھ خبر بھی ہے تجھے موت تیری تاک میں ہے

پوچھتا کیوں ہے کہیں آنکھ کا اندھا تو نہیں
ساری روداد میرے دیدۂ نمناک میں ہے

آتشِ و آب و ہوا بھی ہیں مرے جزو بدن
ان میں کچھ بات نہیں، بات مری خاک میں ہے

عقل اب تیرا فریضہ ہے پرکھنا اُس کو
خاک کا پتلا ہے پر آتشی پوشاک میں ہے

وہ ستارے جو تری چشم فسوں سے تھے گرے
اُن کی وقعت تو مرے دامن صد چاک میں ہے

مجتمع سارے سمندر کی کثافت ہے جہاں
دُرّ نایاب اُسی ساحل ناپاک میں ہے

اک نظر پڑتے ہی کھل جاتے ہیں اسرار سبھی
کیا غضبناک اثر دیدۂ بیباک میں ہے

میرا مشہود ہے وہ لاکھ تخیل ہی سہی
مجھ سے اوجھل ہے مگر وہ مرے ادراک میں ہے

دھو کے رکھ دیتی ہے ہر ایک کثافت کو عزیز
بہتے پانی سی لطافت نگہِ پاک میں ہے

یہ کس نے کہدیا کہ منوّر نہیں ہیں ہم
کیا ظلمتوں میں نور کا پیکر نہیں ہیں ہم

یہ اور بات ہے کہ ٹھہرتی نہیں نظر
صرفِ نظر ہو جس سے وہ منظر نہیں ہم

اِس لفظ "میں" نے ہم کو صفاتی بنادیا
ورنہ حصارِ ذات سے باہر نہیں ہیں ہم

گستاخیوں سے ہی تو سُلجھتی ہیں گتھیاں
پر اِنکشافِ راز کے خُوگر نہیں ہیں ہم

مانا کہ مُشتِ خاک ہیں، ذرّہ ہیں، گرد ہیں
یہ بھی تو سچ نہیں ہے کہ جوہر نہیں ہیں ہم

وہ سنگ ہیں کہ جس پہ عمارت کا بوجھ ہے
یارو کسی کے ہاتھ کا پتھر نہیں ہیں ہم

تنہا سمجھ کے ہم کو نہ لشکر سے کر جُدا
یا یہ بتا کہ شامِلِ لشکر نہیں ہیں ہم

حُسنِ خیال و فِکر مُصوّر ہیں ہم عزیز
جو اپنے آپ بن گیا وہ گھر نہیں ہیں ہم

خاکساری کرتے کرتے خار گھنگھرو بن گئے
خوشہ چیں بھی لیجئے دہقانِ ساہو بن گئے
رات کی تاریکیوں کا ہمسفر کوئی نہ تھا
اِک ندا آتے ہی ذرّے اُڑ کے جگنو بن گئے
اپنی ہستی کو مٹا کر جس نے بخشی تھی حیات
پی کے اُس مٹّی کا خوں کانٹے بھی گلرو بن گئے
وقت کے تیور بدلتے ہی اثر دل پر ہُوا
ترجماں خود حالتِ دل کے یہ ابرو بن گئے
پھول غُنچے اور ہوا سب خوش پیامی کے لئے
گلستاں میں ہر طرف سامانِ خوشبو بن گئے
آتشِ برق و شرر سے تیز ہے وہ شعلہ رو
شام کے سائے سمٹ کر جس کے گیسو بن گئے
سحرِ فتنہ گر جہاں میں جب نمایاں ہوگیا
زندگی کے مرحلے سر چڑھتا جادو بن گئے
دل مرا زخموں سے ہو کر چور جب ساکت ہوا
خون کے قطرے ترے خنجر کے آنسو بن گئے
اِک شعاعِ شمس ہی تھی صبح کاذب کا سبب
جب اندھیرے کاشفِ اسرارِ شب رو بن گئے
جُرم پر اُکسا کے اندھے کو مقید کرلیا
پھر جہاں دیدہ مکر کے خود ترازو بن گئے
خاکِ فانی میں فقط ظرفِ مکاں کا کھیل تھا
ہم برائے نطقِ ذاتی سب من وتو بن گئے
حسنِ کامل کی کشش کا یہ اثر ہے اَۓ عزیزؔ
سارے ضیغم عاشقانِ چشمِ آہو بن گئے

یہ نشیبی راہ ہے دھیمی ذرا رفتار کر
جب ہو اُونچائی مقابل جوش کا اِظہار کر

ڈُوبتے سورج پہ چبھتی آنکھ سے مت وار کر
جب سوا نیزے پہ آجائے تو آنکھیں چار کر

حوصلہ ہی جوہر واحد ہے جینے کے لیے
موت کو دعوت نہ دے یوں زندگی سے ہار کر

زندگی اِک مرحلہ ، اِک کرب ، اِک مشکل سہی
سب اِسے آسان کریں گے تو اِسے دشوار کر

اِک تدبر ہی ترا کافی ہے تیرے واسطے
اس لچکتی پھول کی ٹہنی ہی کو تلوار کر

یہ دِلِ مضطر ہی تو ہے اِک تیرا رختِ سفر
روشنی ذوقِ نظر کی دے اسے ہموار کر

تھام لے پتوار کو دستِ خرد آموز میں
پھیر کر ہر موج کے رخ کو سرِ منجدھار کر

فِکر کی پرواز کو لازم نہیں ہے آسماں
سرنِگوں ہوجا ذرا پھر عرش کا دیدار کر

تلخیٔ حق کب اُترتی ہے گلے سے یہ تو کہہ
لب کشائی پر مری پھر شوق سے اِصرار کر

سربلندی فقر کی پستی میں پنہاں ہے عزیزؔ
اس طرح مختار بن پھر دل کو خود مختار کر

جو کلیاں زینتِ گلشن تھیں خاص و عام کی خاطر
سجائے ہو اُنہیں بازار میں نیلام کی خاطر

وفورِ انبساطِ عارضی کچھ دیر سونے دے
صبح ہوتے ہی کرنی ہے غم و آلام کی خاطر

برائے رنگ و بو پیسا گیا صدیوں تلک مجھ کو
حنا کہہ کر پکارا تب مجھے کچھ کام کی خاطر

بقائے صبح کی خاطر کبھی شعلے اُگلتا ہوں
کبھی چپ سادھ لیتا ہوں سکوتِ شام کی خاطر

بنایا تھا دل و جاں سے جسے پیکر محبت کا
اُسی کو چُن لیا پھر کس لیے دشنام کی خاطر!

بنامِ عشق جو آتش ہے پنہاں میری فطرت میں
ابد تک ہوں میں سجدے میں اُسی الزام کی خاطر

لگا رکھی ہے اِک آندھی مرے پیچھے زمانے سے
سجا رکھا ہے اِک گلزار بھی اکرام کی خاطر

اندھیرا شام کا جس کا مقدر تھا ، وہی جگنو
فضا میں ہوگیا روشن بقائے شام کی خاطر

حصولِ زن ، زمیں ، زر کیلئے بدنام ہے دنیا
عزیزؔ اِک تم ہو کہ مرمٹ رہے ہو نام کی خاطر

اَے مسیحا نُسخۂ حکمت کا حاصِل اور ہے
جو مریضِ دل کو لاحق ہے وہ مشکل اور ہے

بڑھ رہے ہیں پاؤں جس جانب وہ رستہ اور ہے
دِل نے جس منزل کی ٹھانی ہے وہ منزل اور ہے

اور ہی کچھ ہے نظارا میرے دل کے روبرو
منظرِ دنیا نِگاہوں کے مُقابل اور ہے

اور ہے وہ دِل اُٹھا کر دیدیا جو یار کو
جو دھڑکتا ہے مرے سینے میں وہ دل اور ہے

آپ اپنے قتل کی سازش میں خود شامل تھا میں
جس کو ٹھہرایا ہے منصف نے وہ قاتل اور ہے

دین بھی تیرا ہے زاہد اور دنیا بھی تری
میری رُسوائی کے غم میں غم یہ شامل اور ہے

میں تو اُتروں گا بھنور میں ، تو کِنارے پر اُتر
تیرا ساحل اور ہے اور میرا ساحل اور ہے

اب کِسے میں دل کہوں آخر کسے دھڑکن کہوں
غیر ممکن ہے کہ دھڑکن اور ہے، دل اور ہے

یاں اُجالا ہی اُجالا ہے چراغوں کے بغیر
خاکسار اِن دَرِ یزداں کی محفل اور ہے

آج تک کُھلتا نہیں یہ راز کیوں ہم پر عزیزؔ
اور تھا منشاء تو کیوں یہ رنگِ محفل اور ہے ؟!

یہ مت پوچھو کہ کوہِ طور ہے کیا
تمھیں جلنا کہو منظور ہے کیا

دوئی کیا ہے نہ پوچھو، یہ بتاؤ
رگِ جاں بھی ہماری دور ہے کیا

انا الحق کہنے والے کچھ خبر ہے
مآلِ جرأتِ منصور ہے کیا

شعاعِ شمس ہی خود منعکس ہے
نظر کیا ہے، جمالِ حور ہے کیا

نظر آنا، رجھانا، منہ چھپانا
محبت کا یہی دستور ہے کیا

یہ سوزِ عشق یہ زخمِ محبت
جسے کہتے ہیں سب ناسور ہے کیا

پگھل جاتی ہے شمع موم بن کر
یہ پروانہ جو ہے کافور ہے کیا

وصال و ہجر کا یہ کھیل سارا
مجازی آنکھ کا مذکور ہے کیا

اجالا اپنی فطرت سے ہے عاجز
اندھیرا اس لئے مغرور ہے کیا

جنوں کیوں بڑھ گیا ہے حد سے آگے
خرد اس باب میں مجبور ہے کیا

فریبِ آگہی اتنا بتادے
صفات و ذات میں مستور ہے کیا

مجھے کیوں ہو مآلِ زیست کا غم
خدا جانے اسے منظور ہے کیا

سمندر میں عزیز اپنے کو ڈھونڈے
کہو قطرے کا یہ مقدور ہے کیا

میں بھی فانی، تو بھی فانی، اور باقی کچھ نہیں　　اِک خدا کی ذات باقی اور باقی کچھ نہیں

ماسوا جو کچھ یہاں ہے اِک خدا کی ذات کے　　ہے فریب زندگانی اور باقی کچھ نہیں

کلمہ حق میں جو "لا" ہے اس کا معنی ہے "نہیں"　　اس "نہیں" میں سب ہے مخفی اور باقی کچھ نہیں

حاصل مثبت و منفی کیا ہے، منفی کے سوا　　مثبت و مثبت ہے باقی اور باقی کچھ نہیں

ان ہتھیلی کی لکیروں کے علاوہ ہاتھ میں　　ایک پیمانہ ہے خالی اور باقی کچھ نہیں

ایک چھوٹی سی خطا کا اک فسانہ بن گیا　　وہ خطا تھی ابتداء کی اور باقی کچھ نہیں

جس کا مٹنا ہو یقینی اُس کو ہستی کیا کہیں　　نیستی ہے یعنی ہستی اور باقی کچھ نہیں

اصل خاکی خاک ہے اَئے حسنِ فطرت کے اسیر　　یہ سراپا تو ہے فرضی اور باقی کچھ نہیں

شکل و صورت، عادت و خصلت مجازی ہیں مگر　　اُس کا پس منظر حقیقی اور باقی کچھ نہیں

یہ صفاتی آنکھ ہے اور وہ تجلی ذات کی　　دید بوسی لن ترانی اور باقی کچھ نہیں

ہے من و تو یا انا کی گفتگو بیکار کی　　سب سے اچھی ہے خموشی اور باقی کچھ نہیں

ذات اُس کی مظہر آرائشِ حسنِ خودی　　عشق اُسکا وصفِ ذاتی اور باقی کچھ نہیں

"میں" کا یہ لفظِ اضافی درمیاں ہے اے عزیز
"وہ" ہے مثبت "میں" ہے منفی اور باقی کچھ نہیں

محافظ ہے ، سہارا ہے ، بجا ہے
مگر دیوارِ بے در ہے تو کیا ہے؟

مرے عیبوں پہ پتھر پھینکتا ہے
وہ پھر بھی آئینے کا آئینہ ہے

خبر ہے سب کو آگے ہے توقع
قضا پیچھے یہ کس کو پتہ ہے

حسیئے ما خیر و شر کے پیش و پس میں
تری تقدیر ہے یہ اور کیا ہے

بناتا جا گھروندے ساحلوں پر
غرورِ موج کو گر توڑنا ہے

سرابوں کو حقیقت میں بدل دے
اگر دل میں ترے کچھ ولولہ ہے

بکھرنا ہے بکھر جانے دے اِس کو
شکستہ آئینہ کیوں جوڑتا ہے

قلندر ہے تو جا اپنی گھپا میں
سرِ بازار کیوں بیٹھا ہوا ہے

دھڑکنا ہے تجھے اس دل کی مانند
یہی تو زندگی کا فیصلہ ہے

حقیقت اپنی فطرت سے ہے کڑوی
حیاتِ بے مزہ ہی میں مزہ ہے

سمجھداری ہے اپنی حد میں رہنا
گذر جاؤ جو حد سے تو خلاء ہے

عزیز ہوجا خودی سے اپنے بے خود
اسی میں عافیت ہے اور بقاء ہے

یہ دنیا اِک کھلونا ہے ، خُدا ہے
یہ اپنا ہی تماشا ہے ، خُدا ہے

مکاں سے لا مکاں تک اُسکی تُوتی
اُسی کا بول بالا ہے ، خُدا ہے

شروع سے آخری تک اُسکا قصّہ
اُسی کا ہر زمانہ ہے ، خُدا ہے

فقط یہ مَنؔ سے مَنؔ کی گفتگو ہے
مَنؔ و تُو اِک بہانہ ہے ، خُدا ہے

وجود زیست ہے اللہ ہی اللہ
عدمؔ تو ھُوکا سایہ ہے ، خُدا ہے

صفات و ذات کی تقسیم کیسی
اُسی کا یہ سراپا ہے ، خُدا ہے

تجلّی کی تمنّا اس لئیے ہے
نظر ہے ، دل ہے ، شیشہ ہے ، خُدا ہے

عزیزؔ اچھی نہیں تحقیق حق کی
یہی اِک کام اچھا ہے ، خُدا ہے

نظمیں
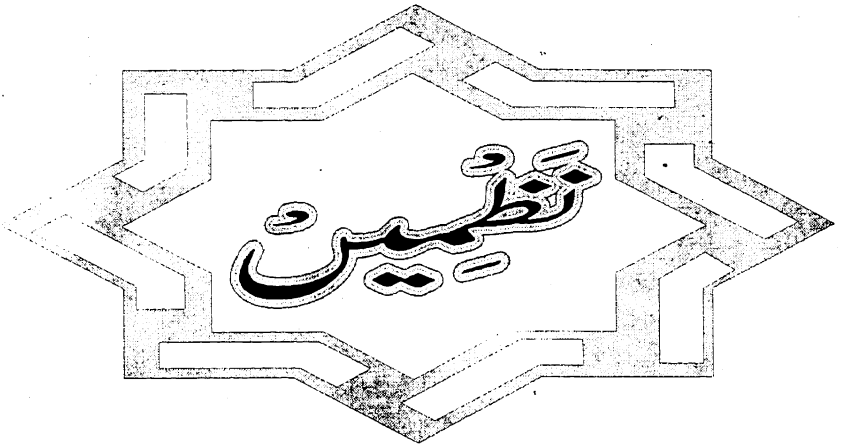
شاعری ہے درسِ عبرت، درد کا پیغام بس ——— یہ وہ فن ہے جس کا حاصل کچھ نہیں جز نام بس
شاعری ہے آیتِ احساس ولمسِ خشک وتر ——— شاعری بھی ہے حدیثِ مسلک الہام بس
شاعری ہے اِک پیام و دعوتِ فکر ونظر ——— پر مآلِ آبیاریٔ لہو بے دام بس!
جانے کتنے رت جگوں کا ماحصل ہے یہ کلام ——— جانے کتنی عرق ریزی کا ہے یہ انجام بس
ہوگئے مجروح ذہن ودل بصیرت کے سبب ——— اور صلہ اس آئینہ سازی کا ہے دُشنام بس
شکوۂ شاعر پہ کیوں اُٹھتی ہیں سب کی انگلیاں ——— کیا جوابِ شکوۂ شاعر سے ہیں وہ رام بس
شاعروں کی مفلسی سے اہلِ زر کا یہ مذاق ——— کیجئے مدح سرائی تو ملیں گے دام بس
تھے فلک کی گود میں لیکن گرے سب ٹوٹ کر ——— وہ ستارے ہیں زمیں پر لقمۂ آلام بس
غالبؔ خستہ کا وہ پختہ کلام خونچکاں ——— اور صلہ خوناب پر تیزابیٔ آلام بس
شاعرِ مشرق کو سمجھی قوم تو بعد از وفات ——— زندگی بھر تھے وہی معتوب وبے آرام بس
یوں تو فانیؔ نے کیا تھا صبح کی خاطر سفر ——— بن گئی مسکن دیارِ غیر میں اِک شام بس
ہوگیا یکا وتنہا شاعرِ خستہ جگر ——— شاعری ردی کی قیمت ہوگئی نیلام بس
سادہ لوحوں کی جمعیت اور یہ شانوں پہ صلیب ——— خلعت واکرام ہیں یہ تہمت والزام بس
شاعری میں میرؔ وغالبؔ، حالیؔ واقبالؔ و دردؔ ——— حافظؔ وسعدیؔ، ورومیؔ، جامیؔ وخیامؔ بس
فانیؔ وحسرتؔ وشبلیؔ، مومنؔ وذوقؔ وظفرؔ ——— داغؔ وسوداؔ، آتشؔ وتابشؔ و اک الہامؔ بس
اصغرؔ وساغرؔ، جگرؔ، یگانہؔ و فیضؔ و فراقؔ ——— نوحۂ انیسؔ ومیکشؔ، وجدؔ کا انجام بس
ساحرؔ وکیفیؔ، علیؔ سردار، مجروحؔ وشکیلؔ ——— قیسیؔ ومخدومؔ، اریبؔ و شاذؔ تشنہ کام بس
شاعرانِ حال کی بابت اگر میں کچھ کہوں ——— مجھ کو یہ ڈر ہے کہ ہوجائے نہ قتلِ عام بس
کتنے انجم سے سجی ہے محفلِ شعر وادب ——— فعل یہ اختر شماری کا ہے اک اقدام بس
گلشنِ شعر وسخن کے سب گلوں کا حال ایک ——— گل بہ دیدہ، گل بہ داماں، گل بہ دل، گلفام بس
اتنی پیاری بستیٔ آدم وہ یہ تلخاب سا ——— منظرِ دنیا ہے اپنے حق میں خون آشام بس

سن کے یہ شکوہ کہا غالبؔ نے اے ہر دل عزیز
بس خدا را یہ فغاں اے عندلیبِ خام بس

مرحوم ساحرؔ لدھیانوی کی نظم ”تاج محل“ پر ایک مخالف تاثر

”جمنا کے کنارے ۔۔۔ تاج“

آنچل کو سلیقے سے ذرا سر پہ سجا کر
آدابِ وفا حسنِ عقیدت سے ادا کر
منظور ہو تجھ کو بھی اگر پاک محبت
جمنا کے کنارے مری محبوب ملا کر

یہ مرمریں مینار کہ محبوب کی باہیں
پاتی ہیں جنہیں دیکھ کے تسکین نگاہیں
ہے جس کی نزاکت پہ حسینوں کو تعجب
اُس صنعتِ نازک کو بھلا کیوں نہ سراہیں

وہ دودھیا چادر میں سمٹتی ہوئی دلہن
یا، پی کیلئے سوگ میں بیٹھی ہوئی برہن
یا جیسے کوئی ماہِ جبیں آب جمن میں
اُتری ہو بصد شرم و حیا کھینچ کے چلمن

خود حُسن بھی و حُسن کی تنویر ہے یہ تاج
اک جستجوئے عشق کی تصویر ہے یہ تاج
معمار نہیں صاحبِ ادراک تھے وہ لوگ
اُن سب کے حسیں خواب کی تعبیر ہے یہ تاج

ہے پاسِ وفا جن کو یہاں آتے ہیں وہ لوگ
احساس ہے تو درسِ وفا پاتے ہیں وہ لوگ
اور جن کو نہیں پاسِ وفا، پاسِ مراتب
توہینِ شہنشاہ پہ آجاتے ہیں وہ لوگ

یہ جاہ و حشم ، شان و شوکت ہو کہ سطوت
رغبت نہیں رکھتی کبھی دولت سے محبت
یہ دولت و حشمت ہیں عنایاتِ الٰہی
کیوں حکمتِ قدرت پہ ہے انسان کو حیرت

یہ شمس و قمر ، انجم و مریخ و زحل سے
نیرنگیٔ دنیا ہے فقط رنگ و نسل سے
غربت ہو ، امارت ہو کہ پستی و بلندی
نافذ ہے یہ قانون یہاں روزِ ازل سے

اس تاج سے ہٹ کر بھی کبھی چشمِ سخنور
کیا تو نے نہیں دیکھے وہ صناعی کے مظہر
پُر شکوہ قلعے ، شہر و باغات و مساجد
بنتے ہیں جنھیں دیکھ کے مفلس بھی تونگر

نسبت ہی نہیں عشق کو کچھ شاہ و گدا سے
یہ رتبہ تو عطیہ ہے جو ملتا ہے خدا سے
یہ تاج شہنشاہ نے جس وقت بنایا
منشاء نہ تھا کھیلے وہ غریبوں کی وفا سے

تو اپنی بھی آنکھوں میں کوئی خواب سجا کر
نظریں اُٹھا عزیز مگر آنکھ جھکا کر
یاں سوتے ہیں دو پیار کی قدروں کے محافظ
اس راہ سے گذرے ہے صبا پاؤں دبا کر

جمنا کہ کنارے مری محبوب ملا کر

(بہ ضمن انتخاباتِ حلقہ اربابِ ذوق ، جدہ ، سعودی عرب) اپریل ۱۹۹۳ء

"مبارکباد"

ہیں شب گزیدہ تو کیا ہوا کہ عزیز تر ہے سحر پرستی
کہ خود پرستی و بُت پرستی کے دَور میں ہو نظر پرستی
وَقار ، بیکس ، خلش مبارک ، جمیل اور اِعتماد بارک
کہ دی ہے تم رَہبروں کو ہم نے یہ بزمِ اُردو کی سرپرستی

عزیز ہو تم تو ہر کسی کے ، تمھاری اُلفت کو کیا پرکھنا
سلیم ہو تم عظیم شاعر تمھاری رفعت کو کیا پرکھنا
معین کی کیا مثال دینا ، رشید کی کیا نظیر دینا
جو قدر مہتاب بڑھ گئی ہے تو اُسکی عظمت کو کیا پرکھنا

خلیل و آعظم ، غنی و عابد سخن شناسوں کو پھر پکارو
یہ کہدو مصعب سے انجمن میں گئی بہاروں کو پھر پکارو
چمک اُٹھے ہیں حسین اُردو کی مانگ میں کچھ نئے ستارے
جو چھُپ کے بیٹھے ہیں بادلوں میں تم اِن ستاروں کو پھر پکارو

تمام اَرکان و عہدہ داروں میں وَلولہ ہو خمار جیسا
اَدیب ، شاعر و ناقدوں میں ہو ربط باہم سِتار جیسا
یہ وقت ہے بس یگانگت کا ، مُشاورت کا ، مُصالحت کا
حسین بزمِ ادب کے رُخ پہ ہے کیوں یہ گرد و غُبار جیسا

جو اہلِ اُردو ہیں اُن کی خِدمت میں کاش پہنچے سلامِ اُردو
خدا کرے کہ ہو جذب اُنکے دِلوں میں پھر سے پیامِ اُردو
ہمارے دِل میں ہی دفن ہوگا ہماری تہذیب کا اَثاثہ
نئی نسل تک اگر نہ پہنچے نظامِ اُردو ، کلامِ اُردو

"نیا سال"

بَلا جیسے ٹلا کرتی ہے سر سے
اَبھی کچھ دیر پہلے ہی ٹلا ہے
پُرانا سال دیوانوں کے سَر سے
اَدھورے خواب پلکوں پر سجا کر
ہمیں تصویر مایوسی بنا کر!

اَبھی کچھ دیر گذری آ چکا ہے
یہ سالِ نو
نئے اوہام لیکر
مُصیبت ہے کہ رَاحت
کیا خبر ہے
نویدِ عید ہے کہ
شامتِ غم
کسی سے کیا کہیں
مبہوت ہیں ہم
مُبارکباد کے خط آ رہے ہیں
دِلاسہ دے کے یہ سمجھا رہے ہیں
تمھیں کو کیوں یہ اندیشہ لگا ہے
تماشا جو بھی ہو گا دیکھنا ہے

یہ کڑوے گھُونٹ ہی تو پی رہی ہے
توقع پر یہ دُنیا جی رہی ہے......

"ایک آس"

گھر سے ہر روز نکلتا ہوں میں اک آس لیئے
دِل میں اک فتح کا احساس لیئے
بھوک کی ہوک ، ضرورت کی کسک
ادھ مرے جسم کی تذلیل و ہتک
ٹوکتے ہیں مجھے ہر روز کہ چل
اس توقع پہ کہ
امید کا سورج نکلے
گھر کی ویران سی دنیا میں اُجالا کرنے
غم سے اُترے ہوئے چہروں پہ مسرت کی کرن
ایسے پھوٹے کہ ہنسی چھن چھن کر
بھیگی پلکوں سے ستارے چُن کر
بے ثمر گود ثمر سے بھر دے ......

"عنکبوت"

ہر گھر کے ہر کونے میں
جال نیا بنتی رہتی ہے
شام و سحر
اپنی دُھن میں اپنی خاطر
ایک ٹھکانہ
تار تار سے جوڑ رہی ہے
دے کر اپنا خونِ جگر
آنے والے کل کی خاطر
آج کی راحت
آج کا ہر سُکھ چین گنوا کر

اُسکو کیا معلوم کہ کوئی
اسکو گھر کا مَیل سمجھ کر
پَل میں اس کے خواب کے جالے
صاف کرے گا
کون ہے اس دُنیا میں
جو اِنصاف کرے گا.......!

"بادل دیکھ کے گھڑے پھوڑنا"

عصرِ حاضر
بھول بھلیوں کا موسم ہے
دنیا ہے ایک ریس کا میداں
مکڑی کے جالے سے دِل میں
ارمانوں کا اِک طوفاں ہے
دھول میں لپٹی ان سڑکوں پر
ناکامی کی دھند ہے چھائی
موت کو پیچھے چھوڑ کے پھر بھی
دوڑ رہے ہیں اندھے سائے
اپنی اپنی موت کے پیچھے
بس ایک جھوٹی آس کا دامن
تھام کے نکلے سب دیوانے
کل کا سکھ پانے کی خاطر
آج کا ہر سکھ چین گنوانا
اپنی عادت اپنی فطرت
اپنے ہاتھوں سے خود اپنی
قبر کھودنا
"بادل دیکھ کے گھڑے پھوڑنا"

"انتباہ"

آدمی عیب و ہنر ہیں مستند تیرے لیئے
سارے دستاویز تیرے ہر سند تیرے لیئے
ہیں قصیدے ہی قصیدے ہو اگر تو نیک خو
ورنہ یہ حرفِ ملامت ، لفظِ بد تیرے لیئے

"جدّت"

تھی ہم میں جتنی لیاقت نچوڑ دی ہم نے
لطافتوں کی کثافت نچوڑ دی ہم نے
بس اطمینان بھری ایک سانس کی خاطر
تمام عمر کی راحت نچوڑ دی ہم نے

"آلودگی"

یہ مژدہ سن کے بوڑھا پیڑ اکثر مسکرایا ہے
شجرکاری کا جذبہ آندھیوں کے دل میں جاگا ہے

خدایا گھٹ رہا ہے دم یہ مصنوعی ہواؤں سے
تمھارے کارخانے میں یہ کیسا کارخانہ ہے

عزیز اس کو ہماری بے بسی سمجھو کہ مجبوری
نہ چپ رہنے کی عادت ہے نہ کچھ کہنے کا یارا ہے

"کربِ تنہائی"

چھایا ہے فلک پر جو گھٹا ٹوپ اَندھیرا
سورج کو لئے کاش نکل آئے سویرا

کچھ دیر سہی خود کو اُجالوں میں چھپالوں
کچھ دیر سہی شمس کی کرنوں میں نہالوں

کچھ دیر مجھے نور کے دھاروں میں بَسادو
گلشن میں ، چمن زار میں ، پھولوں میں کِھلادو

ہر شب کی سیاہی کا زہر مجھ میں بَسا ہے
ہر رات نے ناگن کی طرح مجھ کو ڈسا ہے

یہ زیست اندھیروں میں بھلا کیسے گذاروں
مغرور اُجالو تمھیں کس طرح پکاروں

ویرانے میں رکھّا ہوا میں ایک دِیا ہوں
مجبور ہوں ، مَایوس ہوں ، محرومِ ضِیا ہوں

"کشفِ تنہائی"

تنِ تنہا مقدّر کے ہزاروں سوگ جھیلا ہوں
عزیزو میں تمھارے ساتھ رہ کر بھی اکیلا ہوں

بظاہر نیک جذبوں کا بھی اِظہار کرتے ہیں
مگر یہ جب بھی ملتے ہیں کوئی بیوپار کرتے ہیں
نہیں ہوتی کبھی بے لوث ان کی کوئی ہمدردی
یہ جب بھی بات کرتے ہیں تو پر اَسرار کرتے ہیں

کھلونوں سے نہ بہلاؤ کہ ان سے خوب کھیلا ہوں
عزیزو میں تمھارے ساتھ رہ کر بھی اکیلا ہوں

یہ سچ ہے مجھ کو ڈستی ہیں مری تنہائیاں اکثر
گراں ہوتی ہیں میرے دل پہ بھی رسوائیاں اکثر
زمانے بھر کے غم دل میں چھپا کر مسکراتا ہوں
نظر آتی ہیں پھر بھی کرب کی پرچھائیاں اکثر

مجھے [illegible] تماشائے سراپا غم کا میلا ہوں
عزیزو میں تمھارے ساتھ رہ کر بھی اکیلا ہوں

جہاں میں سخت ناممکن ہے پوری آرزو ہونا
ضروری تو نہیں ہر آدمی کا سُرخرو ہونا
یہ کیسا وقت آیا ہے خدایا آج دنیا میں
کہ اب لازم ہوا ہے بے سبب بے آبرو ہونا

جو ایسے وقت کے دھارے میں بہہ جائے وہ ریلا ہوں
عزیزو میں تمھارے ساتھ رہ کر بھی اکیلا ہوں

بڑا ہی لطف آتا ہے اکیلے دکھ اُٹھانے میں
میں خوش ہوں اس خس و خاشاک کے تنہائی خانے میں
مجھے تنہائی کا طعنہ نہ دو اے انجمن والو
مجھے معلوم ہے کوئی نہیں میرا زمانے میں

لپٹ جاتی ہے جو اپنی ہی شاخوں سے وہ بیلا ہوں
عزیزو میں تمھارے ساتھ رہ کر بھی اکیلا ہوں

اگست ۱۹۷۸ء میں فیملی کی سعودی عرب آمد پر ـــــ ایک تاثر

آہ جب تجھکو مری یاد میں بھرتے دیکھا
بوجھ ہر درد کا سینے سے اُترتے دیکھا

جب ترے حسن کے جلوؤں کو نکھرتے دیکھا
زلفِ ہستی کو پھر اک بار سنورتے دیکھا

جل اُٹھے ظلمت فرقت میں وصالوں کے چراغ
دل کے صحرا میں ستاروں کو اُترتے دیکھا

کھل اُٹھے جھیل سی آنکھوں میں مسرت کے کنول
دل میں ڈوبے ہوئے جذبوں کو اُبھرتے دیکھا

تو ہے خاموش مگر شرم و حیا کی دیوی
زلف و رخسار کو، سرگوشیاں کرتے دیکھا

وصل کا خواب تو دیکھے ہوئے اِک سن بیتا
آج تعبیر کو آنکھوں نے اُبھرتے دیکھا

جس کی تقدیر میں لکھا تھا فقط گرد و غبار
اُسی صحرا سے بہاروں کو گذرتے دیکھا

بات کل کی ہے جو کترا کے گذر جاتا تھا
آج اُس وقت کو اس در پہ ٹھہرتے دیکھا

اک سفینے کو کئی حسرت و ارمان لیئے
دل کے ویران جزیرے پہ اُترتے دیکھا

وصل کی صبح کے آثار ابھرتے ہی عزیزؔ
ہجر کی شب کو دھندلکوں میں بکھرتے دیکھا

ایک پیام ــــــ اصحابِ زر کے نام

پیامِ غم سُنانا ہے مسرت آشنا ٹھہرو
نہ بھاگو وقت کے پیچھے ذرا ٹھہرو ذرا ٹھہرو

جنونِ شوق میں ہر فرض سے منہ موڑے جاتے ہو
یہ کیسی دُھن ہے طاری کس لیئے تم دوڑے جاتے ہو
ذرا مُڑ کر تو دیکھو گر پڑے ہیں ہمسفر کتنے
اندھیرے میں اُنھیں کس کے سہارے چھوڑے جاتے ہو
تمھیں اِنسانیت کا واسطہ اِک ثانیہ ٹھہرو
نہ بھاگو وقت کے پیچھے ذرا ٹھہرو ذرا ٹھہرو

اندھیرا ان کی قسمت ہے یہ تاریکی میں رہتے ہیں
نظر ڈالو کبھی ان پر یہ بے چینی میں رہتے ہیں
سکونِ دل ہے، خوش حالی میسر ہے تمھیں لیکن
مگر یہ وقت کے مارے تو بد حالی میں رہتے ہیں
سُنائیں گے تمھیں بھی بے کسوں کا ماجرا ٹھہرو
نہ بھاگو وقت کے پیچھے ذرا ٹھہرو ذرا ٹھہرو

ضعیفی، اُس پہ غربت کا یہ عالم دیکھتے جاؤ
یہاں ہر آنکھ ہے کس واسطے نم دیکھتے جاؤ
مسرت سے کبھی اپنی اگر فرصت ملے تم کو
یہ ٹھکرائے ہوئے لوگوں کا ماتم دیکھتے جاؤ
سفینہ ڈوب نہ جائے کہیں اَے ناخدا ٹھہرو
نہ بھاگو وقت کے پیچھے ذرا ٹھہرو ذرا ٹھہرو

بسائیں گے وہ گھر کیسے جو روٹی کو ترستے ہیں
ہزاروں تم لٹاتے ہو یہ کوڑی کو ترستے ہیں
یہ مُرجھایا ہوا جوبن یہ کمھلائی ہوئی کلیاں
ذرا دیکھو تو ان کے ہاتھ مہندی کو ترستے ہیں
ضروری ہے یہ غنچوں کیلئے آب و ہوا ٹھہرو
نہ بھاگو وقت کے پیچھے ذرا ٹھہرو ذرا ٹھہرو
پتہ ہے میکشو تم کو کہ مستی کس کو کہتے ہیں
خبر بھی ہے تمھیں آخر کہ ہستی کس کو کہتے ہیں
تمھیں پرواز کی طاقت ہے اڑتے ہو فضاؤں میں
بلندی سے مگر دیکھو کہ پستی کس کو کہتے ہیں
سُنا ہے آسمانوں میں نہیں ہوتی ہوا ٹھہرو
نہ بھاگو وقت کے پیچھے ذرا ٹھہرو ذرا ٹھہرو
طریقِ بے نیازی چھوڑ کو مخلوط ہو جاؤ
مٹا کر نقش ہائے بے رُخی مربوط ہو جاؤ
سہارا دو خدا کے واسطے ان بے سہاروں کو
دِلوں کو جوڑ لو باہم ذرا مضبوط ہو جاؤ
ملے گا پھر تمھیں حق سے بھلائی کا صلہ ٹھہرو
نہ بھاگو وقت کے پیچھے ذرا ٹھہرو ذرا ٹھہرو

میر تقی میر

تم ایک ستم دن کو تو اِک رات کرو ہو
وہ دوست ہو دشمن کو بھی تم مات کرو ہو
دامن پہ کہیں چھینٹ نہ خنجر پہ کہیں داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

"تضمین"

شکوہ ہے کہ ہم سے نہ کبھی بات کرو ہو
تم غیر سے اظہارِ خیالات کرو ہو
ہنس ہنس کے رقیبوں کو اِشارات کرو ہو
محفل میں عجب رنگ کے حالات کرو ہو

"تم ایک ستم دن کو تو اِک رات کرو ہو
وہ دوست ہو دشمن کو بھی تم مات کرو ہو"

بھر بھر کے دے رہے ہو مجھے زہر کے اَیاغ
دل میرا داغ داغ ہے اور تم ہو باغ باغ
کس کی مجال قتل کا الزام دے تمھیں
"دامن پہ کہیں چھینٹ نہ خنجر پہ کہیں داغ"

چُھپ چُھپ کے وہ بچ بچ کے سدا گھات کرو ہو
"تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو"

"ہمسایہ"

ہم سمجھے تھے ہمسائے کا مطلب
سر پر اک سایہ
دل کی دھڑکن ، آنکھ کی جوتی
آتی جاتی سانس کا بندھن
دکھ سکھ میں ہم شانہ ہوگا
جان و مال کا حافظ لیکن
تلخ حقیقت ایسی کب ہے
اس کا تو کچھ اور ہی ڈھب ہے
اس کی نیت اس کی فطرت اور خصلت سے
ڈر لگتا ہے
پوشیدہ ہر راز ہے اس سے
وہ تو اِک دیوار کی مانند
حائل ہے
وہ تو چغلی اور غیبت پر مائل ہے
رشک و حسد کی آگ ہے دل میں
آنکھوں میں نفرت کی جوالا
موت کا سایہ جیسے سر پر رہتا ہے
اپنے گھر میں سب رہتے ہیں
وہ ہمسایہ سب کے سر پر رہتا ہے.....!

"خواہشوں کا سفر"

ذہن ہے اک وسیع بیکراں آسماں
فکر و فن کی طرح دار اک انجمن
حسنِ تصویر حسنِ مصور سے ہے
ہر تصور مصور کی پہچان ہے
آنکھ سورج ، نظر ہے کرن کی طرح
ظلمتوں کو جلا بخشنے کیلئے
دل سمندر دھڑکتی تمناؤں کا
ہر لہر اک یقیں ، ہر لہر اک گماں
موج در موج ہم ہیں ، بھنور در بھنور
پل پل ہر اک پل نیا ایک خوف وخطر
سانس در سانس ہے زندگی کا سفر
لمحہ ہر لمحہ ہے موت بھی ہم سفر
آن ہر آن کچھ کر گذرتے ہیں ہم
روز جیتے ہیں ہم ، روز مرتے ہیں ہم
خاک و خوں میں ہے تر ہر نئی جستجو
ابرِ آوارہ سی گیسوئے آرزو
اپنے انجام سے بے خطر ، بے خبر
دھوپ اور چھاؤں کا ہے یہ اندھا سفر

کچھ ملا بھی تو کیا مل گیا کیا کہیں
کھو گیا بھی تو کیا کھو گیا کیا کہیں
ڈھونڈتی ہے نظر اک حقیقت مگر
لوٹتی ہے سرابوں کا سودا کئیے
کچھ پشیمانیاں ، کچھ ہراسانیاں
اپنے دامن میں ان کے سوا کچھ نہیں

سوچتا ہوں سفر میں میں شام و سحر
منزلیں مل بھی جائیں تو کیا فائدہ
کب سے جاری ہے یہ بیدلی کا سفر
خواہشوں کی یہ خط[1] ہے کہ رکتی نہیں
کب سے کہتا ہوں میں
علی جُب[2] ، علی جُب

---

۱ ۔ خط = (مٹی بس)
۲ ۔ علی جُب = (باز و ہو جاؤ)

"منصوبہ"

زندگی لمبا سفر ہے
نت نئی راہوں سے ہو کر
جانب منزل رواں ہیں
قافلے

کوئی منصوبہ ضروری ہے سفر کے واسطے
منزل مقصود پانے کیلئے
ورنہ اندیشہ ہے بس اس بات کا
راہ ہستی میں بھٹک جائیں گے ہم
چلتے چلتے یونہی تھک جائیں گے ہم.......

اُن ضعیف والدین کی نذر جن کے بچے باہر ممالک میں روزگار یا تعلیم کیلئے مقیم ہیں

" اُترے گا آسمان بھلا خاک پر کہاں "

اِس دَور میں ہے خِدمتِ مادر، پدر کہاں
نورِ نظر کدھر ہے وہ لختِ جگر کہاں
فرزند ہے شکاگو میں، دختر ریاض میں
منزل کہاں پہ رہ گئی، رَختِ سفر کہاں
پرواز وہ تو کرتے ہیں تاروں کے ساتھ ساتھ
اب ان میں ایسی طاقتِ پرواز و پر کہاں
بویا تھا ایک بیج جو فردا کے واسطے
وہ پیڑ بن گیا تو گرے ہیں ثمر کہاں
تنہائی کا یہ گھور اندھیرا ہے چار سو
دیکھے گی اُجالوں کو یہ اندھی نظر کہاں
تکنے کو گھر میں صرف یہ چھت ہی تو رہ گئی
نکلے ہیں گھر کو چھوڑ کے دیوار و در کہاں
آخر وہ تھک کے غم کے بچھونے پہ سوگئے
خوابوں میں لیکے جائیگی یہ رہ گذر کہاں
ممتا کو تولتے ہیں وہ ڈالر کے ساتھ ساتھ
بھوکے وفا کے رکھیں گے یہ مال و زر کہاں
یہ سوچ کر وہ آخری تلخی بھی پی گئے
" اُترے گا آسمان بھلا خاک پر کہاں " !

بو ظفر کی محبت سے لبریز تھی
وہ صراحی نہ جانے کہاں رہ گئی
قدرِ مہتاب کی گھٹ گئی آجکل
سرفرازی نہ جانے کہاں رہ گئی
اعتماد اب کہاں ہے کہ بیکس ہوں میں
باوقاری نہ جانے کہاں رہ گئی
ہجر کی اک خلش ہے جگر میں مرے
ہمرکابی نہ جانے کہاں رہ گئی
بھائی عبداللہ ناظر کی شفقت بھری
سرپرستی نہ جانے کہاں رہ گئی
گونجتی تھی جو سب کی بقاء کیلئے
صوتِ سعدی نہ جانے کہاں رہ گئی
وہ مدینے کی گلیاں وہ روضہ ہرا
سبز جالی نہ جانے کہاں رہ گئی
شہر مکہ ، وہ احرام ، اور وہ حرم
سجدہ ریزی نہ جانے کہاں رہ گئی
پھر اُسی فکر دنیا میں غلطاں ہوں
دینداری نہ جانے کہاں رہ گئی
اے عزیز حق کی مرضی پہ ہے زندگی
اپنی مرضی نہ جانے کہاں رہ گئی

"یادِ ماضی"

بردباری نہ جانے کہاں رہ گئی
خوش مزاجی نہ جانے کہاں رہ گئی

روز و شب لا اُبالی کا عالم ہے اب
ہوشیاری نہ جانے کہاں رہ گئی

غم ہی غم ہیں کھڑے اب مرے روبرو
شادمانی نہ جانے کہاں رہ گئی

فول[۱] و حمص[۲] کی جا دال روٹی ہے پھر
وہ سمبولی[۳] نہ جانے کہاں رہ گئی

پھر رہا ہوں میں آٹو میں شام و سحر
میری گاڑی نہ جانے کہاں رہ گئی

تو بتادے ذرا اے نسیم سحر
"شامِ زلفی" نہ جانے کہاں رہ گئی

بھائی والد کی دل کو لُبھاتی ہوئی
بذلہ سنجی نہ جانے کہاں رہ گئی

اب نہ راہی رہے اور نہ منزل رہی
شہسواری نہ جانے کہاں رہ گئی

فتح و نصرت تھی، ناصر تھے، مسرور تھے
تیغِ غازی نہ جانے کہاں رہ گئی

ہاں وہ مہدی ظفر کی عنایت بھری
میزبانی نہ جانے کہاں رہ گئی

اب نہ جانے ہیں سجاد بابر کہاں
فکر ان کی نہ جانے کہاں رہ گئی

۱۔اور ۲۔ سعودی ناشتہ کی ڈشیں ۳۔ سعودی روٹی

"واپسی"

آدمی ہے چلتا پُرزہ
ایک چیونٹی کی طرح
حرکتِ پیہم میں ہے شام و سحر
اپنی روزی ، اپنے فردا کیلئے
زندگی تحریک ہے
جستجو تحریک ہے
آرزو تحریک ہے
اپنے اپنے آشیاں سے
سب رحیلِ منزلِ ناکام ہیں
کاوشوں کا اِک تسلسل
جدتوں کی مشعلیں تھامے ہوئے
ڈھونڈتے پھرتے ہیں دنیا میں
سکونِ زندگی
چھوڑ کر صحنِ چمن ، ارضِ وطن
ہر متاعِ زندگی
سانس جب تک ساتھ دے
ہے جہاں تک دم میں دم
سب کے سب گرمِ سفر ہیں
پر کسی انجان سے اِک موڑ پر
ساتھ ان کا چھوڑ دیتی ہے یہ ہستی
آرزو و جستجو
اُسکے بعد اِک دائمی منزل کی جانب
ہیں رواں جس پر
وہ رستہ ایک ہے
واپسی ....

"منزلِ نامعلوم"

دن گذر جاتے ہیں اور رات بھی کٹ جاتی ہے
رنجشیں لاکھ سہی ، عمر بھی کٹ جائیگی
جذبۂ دل جو اگر تو نے مرا ساتھ دیا
دل پہ چھائی ہوئی یہ دُھند بھی چھٹ جائیگی

نہ مسرت کی مسرت نہ مصیبت کا الم
ہر طرف گھات میں ناکامی ہے ، رسوائی ہے
کوئی طوفاں ہو کہ منجدھار مقابل میرے
میں نے منزل پہ پہنچنے کی قسم کھائی ہے

تم بھٹکتے رہو صحرا میں میرے ہمسفرو
میں نے گرداب میں چھوڑا ہے سفینہ اپنا
طاقتِ اِذن ہے کیا ، قوتِ مرضی کیا ہے
حق کی مرضی پہ ہے جب مرنا و جینا اپنا

"ٹھکانہ"

ان بہاروں سے جی چرانا ہے
لالہ زاروں سے دور جانا ہے
جا رہے ہیں کہاں یہ مت پوچھو
ریگزاروں میں آشیانہ ہے
بات حق کی ہو جاننا تو سنو
کوئی منزل ہے نہ ٹھکانا ہے!

"جرأتِ موج"

شوریدہ سر امواج کے طوفانی تھپیڑے
جو غرق کیا کرتے ہیں ملاحوں کے بیڑے

وہ موج[1] کہ منجدھار بھی موقوف ہے جس پر
وہ موج کہ جو موج ہے بنیادِ سمندر

وہ موج جو مستی میں کناروں کو تھکا دے
وہ موج جو طوفان کے جذبوں کو بڑھا دے

وہ موج کہ خاطر میں جو لائے نہ ہوا کو
وہ موج جو سمجھے نہ کبھی خوفِ خدا کو

گھائل ہی ہوا جن کے سبب سینۂ ساحل
ٹکرانے چلا ہے انہیں موجوں سے مرا دل

۱۔ موج = (نفس)

"برنداون کا بنجارہ"

آنکھ دہکتے انگارے ہیں ، دل خوشیوں کا گہوارہ
سکھ کی کھوج میں گھوم رہا ہے بستی بستی بنجارہ
اپنی میلی پیٹھ پہ لادے اپنا اُجلا پن سارا
جگنو جیسے اندھیارے میں بانٹ رہا ہے اُجیارا
نوک جھونک کی کڑواہٹ سے پاک ہے اِسکا بھولا پن
میٹھی میٹھی اِسکی بولی ، سیدھا سادھا بے چارہ
مایا جال کے اس میلے سے اس کا کیا لینا دینا
نیند کی چادر تان کے سوتا ہے دھرتی پر اِک تارا
محنت اِس کا اپنا مذہب ، خون پسینہ دھن دولت
شہر کا نٹ کھٹ ، کائیر ، لوبھی اس کو سمجھے ناکارہ
چشمے جیسی اسکی اُمنگیں ، جھیل سی گہری اِسکی لگن
خالی ہاتھ کبھی لوٹا ہے بیچ بھنور سے مچھوارا
خوف کا سایہ اِس کے سر پر ، پاؤں تلے بجلی بادل
پیچھے . پیچھے چاند ، ستارے ، آگے آگے سیارہ
چلتے چلتے سانس جو پھولی ، بڑھ کے منزل پاؤں کو چھولی
اُس کو ہوائیں کیا روکیں گی ، پربت کو جو للکارا
چیل کی مانند دیکھ رہا ہے ، کوّوں کی چھینا جھپٹی
ہتھیارے کی نوچ رہا ہے بوٹی بوٹی ہتھیارا
ساری دنیا کی سکھ شکتی بھر کر اپنی جھولی میں
چین کی بنسی باج رہا ہے برنداون کا بنجارہ

"شاہی جمہوریت"

جب سے کھولی آنکھ ہم نے ملک ہندوستان میں
اک نئی دنیا دکھائی دی نرالی شان میں
دور شاہی تو نہیں لیکن وہی سامان ہیں
کل جو تھے انسان تھے اور آج بھی انسان ہیں
کل جو تھے سارے نظارے تک وہی
چاند، سورج اور ستارے تک وہی
پر یہ کیسا انقلاب

محل و مینار ٹوٹے، تیر بھی تلوار بھی
اب کہاں وہ دل وہ دنیا مٹ گئے آثار بھی
محل کے بدلے ہے بنگلہ
تیر کے بدلے تفنگ
تاج کے بدلے میں ٹوپی
تخت کے بدلے میں کار
شاہ بن بیٹھے ہیں سارے للھ پتی، سرمایہ دار
اس نرالے دور میں ہیں مفلس و نادار بھی
جن کی محنت سے کھڑے ہیں محل بھی، مینار بھی
کس کو ہے احساس آخر ان کی بھوک اور پیاس کا
آج ہر کوئی ہے بندہ اپنی اپنی آس کا

اک طرف ہے فقر و فاقہ
اک طرف عیش و نشاط
اک طرف ننگے ہی ننگے
اک طرف ہر دم لباس
اک طرف ہیں قہقہے
اور اک طرف ہیں سسکیاں
اک طرف ہے روشنی
اور اک طرف تاریکیاں

مئے کے بدلے خون سے لبریز ہیں جام و سبو
کتنا سستا ہو گیا ہے آج آدم کا لہو

آج کتنا بھی ہو روشن ۔ کل کی رونق اور تھی
سچ اگر پوچھو تو کل کی بات ہی کچھ اور تھی

آصف سابع کی برسی پر نذرانۂ عقیدت

حال کی تاریخ میں

ہم نے پڑھا تھا سنہرے دور کے اُس باب کو

آصفِ سابع، نظام الملک، سالارِ دکن

جو امیر انجمن تھا اور معمارِ چمن

ہر ورق پر اُس مثالی حکمراں کا ذکر تھا

سادگی، بندہ نوازی، خیر خواہی، خوشدلی

علم و دانش، فلسفہ، شعر و سخن کا ذکر تھا

نقشِ صنّاعی عیاں ہیں آج بھی

اور تازہ ہیں سبھی آثار بھی

آسماں آزاد تھا ہر دُھند سے

اور منور تھا ہر اک ذرّہ یہاں

چاند، سورج اور ستاروں کے سبب

پر یہ سب کچھ خواب ہے اپنے لیئے

ہم نے جب سے آنکھ کھولی

اپنی ننگی آنکھ سے دیکھا ہے اک سورج گہن

نور آنکھوں کا کبھی کا بجھ چکا

اور سبھی احساس اپنے مر چکے

اب یہ عالم ہے عزیزو

آنکھ کا غم ہے نہ منظر کا الم

" اَے وطن ہندوستاں "

عصرِ حاضر میں ہُوا جب
غَلبہءِ جمہوریت
اس صدی کا شاہ کار
سب کے دل کا ترجماں
آرزوئے بیکراں
ابتداءِ مینارِ نور
بڑھتے بڑھتے بن گیا شعلہ، شرر
رفتہ رفتہ انقلابِ منفرد
آئینہ دِکھلا گیا
نوچ کر چہروں سے اِنکے ہر نقاب
کھول دی دل کی کتاب

نیتیں قربانیوں کی
دھونڈتی پھرنے لگیں قربانیاں
بن گئے جلاد رہبر
جوگیوں کا روپ دھارے
اُف یہ قاتل سنگریزے
قاتلِ جمہوریت
قوم سے عہدِ وفا کو توڑ کر
چاردیواری نئی تعمیر کی
یہ سیاست دان، یہ سرمایہ دار
بانیِ دہشت، دھرم کے ٹھیکدا
اجتماعی کاوشوں سے
وندناتی سازشوں سے

بس میں کرلی طاقتِ ارض و سماء
پھاند کر دستور کی ہر اِک فصیل
پھونک کر قانون کی سب سرحدیں
قُرق کرلیں دولتِ امن و اماں
رہن رکھ لی عزتِ ارض وطن
بیچ کر کردار کا ترکہ سبھی
لُوٹ کر اجداد کا ورثہ سبھی

نت نئی جنت کے خواب
نت نئے نعروں کا اک انبار ہے
کاغذی ایثار ہے

اپنی اپنی کوٹھیوں میں بیٹھ کر
اپنا لوہا قوم سے منوالیا
اب یہی سردار ہیں
درپۂ آزار ہیں
ہر غریب و وسط طبقے کیلئے
ہر شریف النفس فرقے کیلئے
بن گیا آتش فشاں
زلزلوں کا اِک جہاں
اِک اذیت کا نشاں
جل رہا ہے گلستاں
اَے وطن ہندوستاں ، ہندوستاں ، ہندوستاں......

"اژدھا"

ہم سمجھتے تھے کہ
ہم محفوظ ہیں
حافظِ ہندوستاں
پاسبانِ آسماں
سینۂ کوہِ ہمالہ
ہے محافظ قوم کا
رفعتوں پر جس کی دنیا سر نگوں
تُند خو و تیز رَو گنگ و جمن
روک دیں گی
دُشمنوں کے اِس طرف بڑھتے قدم
یہ یقیں بے شک ہمارا سچ ہوا
خارجی طوفاں کا خوف
ہو گیا معدوم
لیکن

سر اُٹھائے اژدھا اِک
داخلی طوفان کا
اپنے بس میں کر لیا سارا وطن
اُسکے مُنہ میں قوم ہے اُتری ہوئی
اُسکے ہر اِک گھونٹ میں
دبتی گئی ، کٹتی گئی
گھٹتی گئی
اور کچھ دم گر یہی عالم رہا
وہ نگل جائیگا ساری قوم کو
اژدھا وہ داخلی طوفان کا ....!

"تو پھر اس عمارت کا حافظ خدا ہے"

یہ سچ ہے کہ اپنا وطن اِک چمن ہے
مگر حبس کیسا یہ کیسی گھٹن ہے

نہ پیڑوں پہ پھل ہیں، نہ پھولوں میں بو ہے
چمن کی ہر اک شاخِ گل پر عدو ہے

وہ ندیوں میں کل کی روانی نہیں ہے
لہو ہے مگر ان میں پانی نہیں ہے

جو موسم سہانے تھے سب چل بسے ہیں
جو لب پر ترانے تھے سب چل بسے ہیں

جو معمار کا خواب تھا وہ کہاں ہے
وہ جذبہ جو بیتاب تھا وہ کہاں ہے

یہ کیسی عمارت بنانے چلے ہو
بنانے چلے ہو کہ ڈھانے چلے ہو

ستونوں میں باہم نہیں ربط کوئی
نہ دیواروں میں نظم اور ضبط کوئی

نہ چھت اپنا بوجھ آپ اُٹھانے کے قابل
نہ بنیاد ہے اس عمارت کی حامل

بہت خوبرو ہیں ترقّی کے زینے
یہ اونچائی سے خود کشی کے قرینے

عجب نقش کاری ہے تہذیب نو کی
دراڑیں نمایاں ہیں تخریبِ نو کی

شکستہ ہیں در آبدیدہ دریچے
تمنائیں مردہ ہیں ملبے کے نیچے

جو کھائی میں تھے وہ ہمالا نشیں ہیں
وہ کھدر میں ملبوس بالا نشیں ہیں

ہیں جتنی بھی شاخیں سبھی جھک چکی ہیں
جڑیں ، پیڑ کا سب لہو چوس لی ہیں

محافظ یہی سازشوں کی ہوا ہے
تو پھر اس عمارت کا حافظ خدا ہے

"وہ سحر لوٹ کر آ گئی بھی تو کیا !"

وہ صبح
کہ جس کی تمنا میں ہم
آج تک رات کی
ظلمتوں میں ہیں گم
ظلمتیں بھی ہیں ایسی گھنی ظلمتیں
چاند ، سورج ، ستاروں کو جو کھا گئیں
آج تک ہے حکومت اسی رات کی.....!

روزِ اول سے اب تک...... یہی تو ہوا !
منبعِ نور لیکر نکلتے ہوئے
کتنے ہی سورجوں کو ہڑپ کر گئی
جس کی باہوں میں لیکر کئی سسکیاں
ہچکیاں
روشنی کی کرن مر گئی
وہ سحر جس کی امید میں روز ہم
ہنس کے پیتے رہے
تلخیاں رات کی
اور پیتے رہیں گے قیامت تلک
وہ سحر لوٹ کر آ گئی بھی تو کیا
اس سحر کی بھی اک شام ہو گی ضرور
شام ہو گی تو پھر رات ہو گی ضرور
رات ہو گی تو پھر بات ہو گی وہی
وہ سحر لوٹ کر آ گئی بھی تو کیا......!

"زبانِ یار مَنْ تُرکی و مَنْ تُرکی نمی دانم"

غریبی ، مُفلسی کیا ہے ، بتاؤ بے کسی کیا ہے
یہ فاقہ مستیاں کیوں ہیں ، یہ طرزِ خُود کشی کیا ہے
زباں کیوں بند ہے آخر تمھاری بے بسی کیا ہے
اگر پوچھو تو ہر مُفلس حمیت سے یہ کہتا ہے
" زبانِ یار مَن تُرکی و مَن تُرکی نمی دانم "

کہیں پر دولت و ثروت کی بارش بے تحاشا ہے
ہمیشہ عیش و عشرت کا وہاں پر بول بالا ہے
اگر پوچھو تونگر سے یہ نعمت کیسے پایا ہے
تو ظالم سر جُھکا کر بس خجالت سے یہ کہتا ہے
" زبانِ یار مَن تُرکی و مَن تُرکی نمی دانم "

بہ شکل مُشک بو رشوت ہوا میں ہوگئی مُدغم
یہاں ملہار گاتا ہے ، کوئی ٹھمری ، کوئی سرگم
یہ خوشبو سُونگھتے ہیں شوق سے کیوں حضرت آدم
زمانہ ساز آدم آدمیت سے یہ کہتا ہے
" زبانِ یار مَن تُرکی و مَن تُرکی نمی دانم "

یہ تم میں بے حسی کیوں ہے، یہ طرزِ بے رُخی کیا ہے
نظر میں یہ کہو آخر مقامِ آدمی کیا ہے
کوئی پوچھے جو رہبر سے رعایا پروری کیا ہے
چڑھا کر تیوریاں اپنی متانت سے یہ کہتا ہے
" زبانِ یار مَن تُرکی و مَن تُرکی نمی دانم "

یہاں قانون کا پرچم ہوا میں لہلہاتا ہے
یہاں ناکردہ جرموں کی سزا انساں پاتا ہے
یہاں مجرم کھلے بازار میں کیوں سر اُٹھاتا ہے
تو مُنصف فیصلے میں خود عدالت سے یہ کہتا ہے
" زبانِ یار مَن تُرکی و مَن تُرکی نمی دانم "

بھروسہ شیخ کا نہ برہمن کا کچھ ٹھکانہ ہے
عبادت، پاٹھ، پوجا ہی تو اِنکا آب ودانہ ہے
فقط کم ظرف انساں ہی یہ دونوں کا نشانہ ہے
یہ سب کیوں ہے تو ہنس کر استقامت سے یہ کہتا ہے
" زبانِ یار مَن تُرکی و مَن تُرکی نمی دانم "

شہادت بابری مسجد کی پہلی سالگرہ پر ۔۔ ۶ / ڈسمبر ۱۹۹۳ء (بمقام جدہ)

دو شعر

جھیل کے ٹھہرے ہوئے پانی کو ناحق چھیڑ کر
مشتعل موجوں کو شر انگیز کہتی ہے ہوا
اس کی فطرت میں نہیں ٹھیراؤ یا سنجیدگی
ہر گھڑی جذبات کے دھارے میں بہتی ہے ہوا

(اس سانحے پر خود مادرِ ہند کے تاثرات)

انقلابِ وقت کی ہیئت پہ حیرانی میں ہوں
عکس ہے خشکی پہ میرا اور میں پانی میں ہوں

سر اُٹھاؤں کیا لئیے ماتھے پہ ٹیکا خون کا
سرنگوں ہوں جیسے سولی کی پشیمانی میں ہوں

وقت کے دھارے میں بہتے دور سے دیکھو مجھے
اب قریب آنا نہیں میرے کہ طغیانی میں ہوں

پھر مجھے اقبالؔ سا گلزار ہیں دیدے خدا
دیدہ ور کوئی نہیں اندھوں کی نگرانی میں ہوں

جوشؔ نے حالات کے بخئیے ادھیڑے ہیں عزیزؔ
ہوش آسکتا نہیں جس میں وہ ہیجانی میں ہوں

"پانچ ب"

بیت المقدس ، بوسنیا ، بغداد ، بابری مسجد ، بمبئی ، مورخہ ۲۰/اگست ۱۹۹۳(جدہ)

"بربریت کا سفر"

بڑا چالاک تھا قاتل کا چہرہ کس نے دیکھا ہے
زمانہ نیند میں تھا یہ تہلکہ کس نے دیکھا ہے

تباہی کا یہ کس نے صُور پھونکا کس نے دیکھا ہے
وہ پل بھر میں کھڑی فصلوں کا جلنا کس نے دیکھا ہے

وہ شر انگیز فتنوں کا اُٹھنا کس نے دیکھا ہے
اہنسا کی زمیں پہ بھی ہے ہنسا کس نے دیکھا ہے

گلی کوچوں میں تھا اِک زلزلہ سا کس نے دیکھا ہے
سروں پر آگرا تھا سر کا سایہ کس نے دیکھا

دلوں میں کھولنا آتش فشاں کا کس نے دیکھا ہے
وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں کا لاوا کس نے دیکھا ہے

اندھیرے بانٹتا ہے کیوں اُجالا کس نے دیکھا ہے
چراغوں کے دلوں میں بھی ہے دعوی کس نے دیکھا ہے

کیا لمحوں نے کیوں صدیوں کا سودا کس نے دیکھا ہے
کہ اس رت پر ہے کیوں اُس رت کا قرضہ کس نے دیکھا ہے

گواہوں پر جو طاری تھا وہ سکتہ کس نے دیکھا ہے
ہوئی جنبش تو ڈر کے بس یہ کہنا کس نے دیکھا ہے

زمانہ سرخیاں اخبار کی پڑھتا رہا لیکن
لہو میں تر بہ تر لاشے پہ لاشہ کس نے دیکھا ہے

غذا ہے اب فقط اُنکے لئے بندوق کی گولی
کہ اُنکے سامنے روٹی کا ٹکڑا کس نے دیکھا ہے

یہ آدم کا لہو اک بار جو پی لے تو کیا چھوٹے
وہ [illegible] تھا برسوں کا پیاسا کس نے دیکھا ہے

منظّم سازشیں ہیں کارفرما اس طرف ہر دم
ادھر ہے منتشر میرا قبیلہ کس نے دیکھا ہے

ہمارا احتجاج و بدماغی سب نے دیکھی ہے
تشدد کا جو اس میں ہے سلیقہ کس نے دیکھا ہے

غذا ہے اب فقط ان کے لئے بندوق کی گولی
کہ ان کے سامنے روٹی کا ٹکڑا کس نے دیکھا ہے

گدھوں کی طرح منڈلاتے ہوئے دشمن کے طیارے
وہ دشمن پھر بھی تھا سہما ہوا سا کس نے دیکھا ہے

مدارس ، گھر ، دواخانے ، مساجد اور تہہ خانے
ہوئی یلغار جن پر بے تحاشا کس نے دیکھا ہے

سخاوت کا ڈھنڈورہ پیٹتے پھرتا ہے وہ لیکن
ہمارے آہنی ہاتھوں میں کاسہ کس نے دیکھا ہے

زمانے کی نظر ہے بابری مسجد کے ملبے پر
کروڑوں دل جو ٹوٹے اُن کا ملبہ کس نے دیکھا ہے

اُسی دل پر ہوئے ہیں روز اول سے ستم لاکھوں
وہ دل کہتے ہیں جس کو گھر خُدا کا کس نے دیکھا ہے

مُقیّد اُسکو کر بیٹھے منادر میں مساجد میں
جو بحر بیکراں ہے بے کنارا کس نے دیکھا ہے

پیمبر تھا محبت کا وہ جس کو رام کہتے ہیں
تشدد کو مٹایا تھا کہنیا کس نے دیکھا ہے

کیا ہے رام کی دھرتی پہ پھر سے رقص راون نے
ہے اِسکا سچّے بھگتوں کو جو صدمہ کس نے دیکھا ہے

بدن کو کاٹ کر ٹکڑے تو کر سکتی ہے یہ لیکن
کسی تلوار سے پانی کا کٹنا کس نے دیکھا ہے

یہ پانی ہوگیا تقسیم سارے باغبانوں میں
چمن ہے کس لئے اُجڑا ہوا سا کس نے دیکھا ہے

یہ ہوگا نقشہ دنیا کو لیکر کل نئی نسلیں
یہ پوچھیں گی کہاں اپنا وطن تھا، کس نے دیکھا ہے

سنبھل جاؤ عزیزانِ وطن اب بھی سنبھل جاؤ
یہ جھگڑا آج بھی ہے اپنے گھر کا کس نے دیکھا ہے

"عصرِ حاضر"

زاہدِ وقت گناہ گار ہے اللہ کی پناہ
اب مسیحا مرا بیمار ہے اللہ کی پناہ
قوم خود برسرِ پیکار ہے اللہ کی پناہ
کوئی رہ بر ہے نہ سالار ہے اللہ کی پناہ

کوئی مغرور ہے مختار ہے اللہ کی پناہ
کوئی مجبور ہے لاچار ہے اللہ کی پناہ
ہر کوئی زر کا طلبگار ہے اللہ کی پناہ
ہر طرف مصر کا بازار ہے اللہ کی پناہ

لالہ و گل نہ رہے اب وہ گلستاں نہ رہے
سامعیں وجد میں آئیں وہ غزلخواں نہ رہے
حسن کے ناز گئے عشق کے پیماں نہ رہے
درد تھا جن کے دلوں میں وہی انساں نہ رہے

کس سے پوچھوں کہ مرے درد کا درماں کیا ہے
سوئے منزل تو چلا ہوں مرا ساماں کیا ہے
پوچھتا ہوں دلِ مایوس سے ارماں کیا ہے
دل بھی چھلنی ہے مرا چاک گریباں کیا ہے

زخمِ ساحل بھی عبث ، زورِ تلاطم بھی عبث
نالہ فرسائی عبث ، رنگِ تبسم بھی عبث
ہے عبث وجہہ خموشی و تکلم بھی عبث
سچ تو یہ ہیکہ یہاں میں بھی عبث ، تم بھی عبث

"اخبار"

ہر صبح

اخبار والا

پھینک کر جاتا ہے میرے سامنے

حادثے ، کچھ سانحے ، کچھ مرحلے ، کچھ مسئلے

میرے پڑھنے کیلئے

ساری دنیا کی نئی تازہ

سیاسی سازشیں

اپنی اپنی سرحدوں کے واسطے

نت نئی کاوش

نئی جدّت

نیا جبر و قہر

دنیوی توقیر کو

یا ستاروں کی نئی تقدیر کو ، تسخیر کو

خودکشی ، چوری ، ڈکیتی

جائیدادوں کی یہ جنگ

یا علاقائی قہر

اک قیامت خیز منظر

چند صفحوں میں سمایا کس طرح

روز پڑھتا ہوں یہ خبریں

سوچتا ہوں روز کہ

یہ بقا کے واسطے ہیں یا فنا کے واسطے

"ظلم کی آندھیاں"

ظلم کی آندھیاں
رفتہ رفتہ بڑھیں
گر گئے گھر، شجر
بستیاں پھونک کر
بڑھتے بڑھتے یہاں سے وہاں ، ہر طرف
ساری دنیا کے اعصاب پر چھا گئیں
ساری قوموں کی تہذیب کو ڈھا گئیں
ظلم کی آندھیاں

قوم کس قوم کی بات کرتے ہو تم
درس ، کس درس کی بات کرتے ہو تم
سی چکے لب کو سب معتبر آدمی
دور تک اب نہیں راہ بر آدمی
راہ بر ہو تو اس کا وصی کون ہے
ہمنوا کون ہے ؟

سر کٹانے کا جذبہ فوت ہو گیا
گھر لٹانے کی ہمت کسی میں نہیں
ہے اگر سر فروشی کی تحریک تو
ایسی تنظیم کے سر پھرے لوگ ہیں
وہ تو مجنون ہیں!

ظلم سہتے ہوئے اب تو مظلوم بھی
ظالموں کی اطاعت میں مشغول ہیں
ظلم کی آندھیوں سے ہے سہمی ہوئی
ساری خلقت یہاں
کون ہے یہ کہو اس بلا کا جواب
ایک حق کے سوا

حق کی آواز بھی کون سنتا ہے اب
کس کو معلوم قہر الٰہی ہے کیا
آسمانی صحیفوں کا حافظ خدا
ان صحیفوں کا کیا تذکرہ دوستو
حق کی آواز بھی طاق پر رہ گئی.....!

"زنجیرِ دار"

ہر طرف ، حدِ نظر تک
محلِ شاہی ، قصرِ سلطانی ہیں استادہ مگر
وارثوں میں اب کہاں
وہ عدل گستر
حق پسند و حق نگر
اب کہاں نوشیرواں واسکا در
جس کے در پر
کل تھی آویزاں کوئی
"زنجیر داد"

وہ جہانگیری عدالت بھی نہیں
کہ جس کے در پر تھی کبھی
"زنجیرِ عدل"
اب مکانوں پر کہاں "زنجیرِ در"
سب کے سب ہیں خود غرض و کم نظر

اب کوئی اکبرؔ ، علیؔ عادلؔ
بکرماؔجیت سا منصف کہاں
جن کے در پر جا کے دستک دیجئے
کیجئے آہ و بکا

نالۂ فریاد اب تو
ہے صدائے بے صدا
کون پرسانِ بشر ہے
ایک حق کے ماسوا

کھٹکھٹایا در عدالت کا کوئی
مردِ جلیل
قہر ہی بڑھ کر کسے گا
اس کی مشکیں
کھینچ لائے گا اُسے یوں زیرِ دار
جیسے فریادی نے کھینچی تھی فقط
"زنجیرِ دار"

"سرِ دار"

حاملِ اُلجھن و افکار نظر آتا ہوں
جھوٹی تکرار سے بیزار نظر آتا ہوں

خوابِ غفلت کے مزے اب ہیں میسّر کس کو
عالمِ نیند میں بیدار نظر آتا ہوں

خوفِ طوفاں ہے نہ ساحل کی تمنّا مجھ کو
آپ خود باعثِ منجدھار نظر آتا ہوں

میرے سائے سے بھی ڈرتا ہے زمانہ لوگو!
جیسے گرتی ہوئی دیوار نظر آتا ہوں

امن کے دور میں مینارِ محبت میں ہوں
عالمِ جنگ میں تلوار نظر آتا ہوں

آپ حاکم ہیں نظر آتے ہیں ایوانوں میں
میں ہوں سردار سرِ دار نظر آتا ہوں

"بجٹ"

پربتوں کو رائی ہر قطرے کو قلزم کردیا
اس نئے میزان نے ہم سب کو گم سم کردیا
قوم کے ہر زخم کو دیکھا تھا جو روتے ہوئے
قتل کا اعلان وہ زیر تبسّم کردیا

"حوصلہ"

سو رہو چپ چاپ ہر اِک غم سے نپٹا جائیگا
رات کٹ جانے بھی دو کل صبح دیکھا جائیگا
ناپتے ہو طولِ آہِ سرد کو نالوں سے کیوں
وقت کو تیغ تدبّر سے ہی ٹالا جائیگا

"دلاسہ"

آنکھوں میں دھرا کیا ہے جو تم جھانک رہے ہو
کیوں اپنی گیسوؤں سے مجھے ڈھانک رہے ہو
دیتے ہو دلاسہ تو کچھ ایسا ہی لگے ہے
ٹوٹا ہوا کرتے کا بٹن ٹانک رہے ہو

"مسیحائی"

ذرا تو سوچ اَےٴ دانا کہ دانائی سے کیا ہوگا
مقابل جب ترے پربت ہے تو رائی سے کیا ہوگا
مشیت کو نہ ہو منظور جب تیری مسیحائی
مسیحا ،پھر بتا تو ہی ، مسیحائی سے کیا ہوگا

"مشورہ"

آج سچّائی کی کچھ قیمت نہیں
آدمیت کی کوئی وقعت نہیں
چاک دامانی کو سینے کیلئے
مال وزر لازم ہیں جینے کیلئے
قوم دیکھو کام کتنے کر گئی
آدمیت مرگئی تو مرگئی
کس قدر پچھڑے ہوئے ہو تم میاں
دور کتنی دور جا پہنچا جہاں
مفلسی پہ اپنی تم اینٹھے ہو کیوں
بھوک لگتی ہے تو چپ بیٹھے ہو کیوں
تم بھی خنجر سے لہو چاٹا کرو
خوب چلتا ہے یہی دھندہ کرو
بیچ دو اجداد کی تہذیب کو
ہے یہی موقع اُٹھو تخریب کو
قوم کے حق میں بنو جب ناگ تم
پہلے ہنسا کی لگاؤ آگ تم
قتل اور غارتگری جب کر چلو
پھر اہنسا کی سمادھی پر چلو
ہاتھ میں کچھ پھول مالائیں لیئے
خون کے جلنے لگیں گے پھر دیئے
جب یہ چولا پہن کر آجاؤ گے
قوم کے تم رہ نما کہلاؤ گے

مُحاسبہ

محتسب کیا ، حساب کیا شئے ہے
کون حاسب ہے یاں
محاسب کون
یعنی محسوب کا خدا حافظ
نیتوں کا فتور جاری ہے
جرم و مجرم ، مفتش و تفتیش
بحث ہو یا مباحثہ ، کچھ ہو
ہر ثبوت ، ہر گواہ جھوٹا ہے
عدل و انصاف ہی نے لوٹا ہے
فیصلے اب ہیں حقیقت سے پرے
کیا کرے کوئی اور کیا نہ کرے
مسئلہ بن گئی ہے ہر فریاد
مرحلے سارے ہو گئے مشکوک
نیتوں کا فتور جاری ہے
ہر ترازو پہ بات بھاری ہے
محتسب کیا ، حساب کیا شئے ہے

"خشت و سنگ"

خشت کی ہے حیثیت
خشخاش سی
منحصر ہے اس پہ لیکن
ہر عمارت کا وجود
خِشت سے جب خشت ملتی ہے
تو بنتا ہے مکاں
ٹوٹتی ہے خشت تو
دیوار سے دیوار کی بنتی نہیں
پھر دراڑیں پھیلتی ہیں ہر طرف
سب مکینوں کو جگانے کیلئے
زخم پر مرہم لگانے کیلئے

سنگ اِک بنیاد ہے
ہر عمارت اس پہ ہے ٹھہری ہوئی
یہ زرا اپنی جگہ سے گر ہٹا
اس کے سر پر ہی گرے گا
یہ مکاں

خشت و سنگ
ہیں یہی اسبابِ تشکیلِ مکاں
جب تلک مربوط ہیں
وجہہ تسکین مکان
گر تصادم ہو گیا
تو خشت کا ہر احتجاج
سنگ کی اک چوٹ کا مُحتاج ہے
ہے یہی تو
خِشت و سنگ کی داستاں.......

"اعتماد"

اعتماد اِک وصف ہے ایقان کا
ایمان کا ، انسان کا
جیسے سورج وقت کا پابند ہے
صبحِ صادق سے ظہورِ شام تک
مَطلع ہستی سے پھر انجام تک
فرض کی تکمیل کا بیّن ثبوت
ہے اِسی تمثیل کا اِک اور نام
اعتماد.......

"دوستی"

رَبطِ باہم ، ضَبطِ پیہم
شرطِ اُلفت دائمی
اَز دمِ تاسیس سے
تا دمِ آخر تلک
ایک جذبِ استقامت کا ہے نام
دوستی.........

"معاہدہ"

یہ دنیا خواب سی ہے
زندگی اِک نیند کا عالم
ہزاروں نعمتیں بکھری پڑی ہیں
جھوٹی تعبیروں کی مانند
آزمائش کیلئے
عارضی ہے زندگانی
مستقل امید ہے
زندگی محسوس کرتی ہے ضرورت
ہر ضرورت مانگتی ہے
ایک قیمت ، اک ضمانت ،اک عہد
ہر ضرورت ڈھونڈتی ہے راستے
زندگی ممکن نہیں ہوتی
شراکت کے بغیر
غیر ممکن ہیں فرائض
عہدوپیماں کے بغیر
عہدوپیماں منحصر ہیں
نیتوں کی ساکھ پر
اک طرف ہے
حرص ولالچ اور خیانت
اک طرف
دل میں امانت اور دیانت جاگزیں
اک ندی کے دو کنارے
روبرو ہیں
پر کبھی ملتے نہیں......

"انحراف"

اک عجوبہ ہے یہ دنیا
ان گنت مخلوق سے پر
اک عجائب گھر ہے یا
ایک سرکس ہے کہ زو
آدمی بستے ہیں یوں تو ساری دنیا میں مگر
اختلاف شکل و صورت
عادت و خصلت
پئے رنگ و نسل ہے آشکار
کوئی صورت ہو کسی صورت سے ملتی ہی نہیں
کوئی فطرت ہو کسی فطرت سے ملتی ہی نہیں
ہر طبیعت مختلف ہے
مختلف فکر و نظر

مسئلہ گر ایک ہی ہو
حل مگر کب ایک ہے
امتحاں گر ایک ہی ہو
کب نتیجہ ایک ہے
گفتگو ہو ، مشورہ ہو
فرد کا یا انجمن کا مسئلہ ہو
اختلافی ، احتجاجی جنگ ہے

یکجہتی ، ایک مرکز
ہر زمانے کا تقاضہ تھا
ابھی تک ہے
رہے گا تادم دنیا مگر
آج تو یہ خواب ادھورا ہے عزیز
اور اس کا اک سبب ہے
انحراف....

"اِتحاد"

نہیں ہیں متحد الفاظ جس کے
سمجھتا کون ہے مفہوم اس کا
ازل سے اتحاد اک خواب سا ہے
ابد تک خواب کا عالم رہیگا
صدا اس سانحے کا غم رہے گا

اسی کے واسطے مذہب بنے ہیں
اسی کے واسطے قانون بھی ہے
مخالف ہیں مذاہب کے عقائد
منافق ہوگئے منصف کے منصف
کہاں مذہب کی پابندی ہوئی ہے
کہاں قانون کے آثار ہیں اب
کہاں مذہب کے تابعدار ہیں اب
مسیحا سب کے سب بیمار ہیں اب......!

"ساکھ"

شخصیت کی اساس ہے نیکی
آدمیت کا اعتبار مدار
زندگی ہے تو اعتماد سے ہے
کارگاہِ حیات کی کنجی
جذبہ دردِ امانت ہے عزیز
طاقتِ دین و دیانت ہے عزیز
عزت و شہرت و سطوت کیا ہے
یہ وجاہت یہ رمز حسن سلوک
ایک پہچان اک علامت ہے
شخص کی یا کسی شراکت کی
آنکھ باقی ہے تو بینائی سے
سلب ہو جائے جو بینائی تو
یہ سمجھ لو کہ اس کی آنکھ گئی
اٹھ گیا اعتبار تو سمجھو
دل گیا، درد گیا
ساکھ گئی

"تسلط"

بظاہر دور سے دیکھا تو دریا
بڑے صبر و سکوں سے بہہ رہا تھا
مگر نزدیک سے دیکھا تو پایا
تلاطم خیز موجوں کا کرشمہ

یہی اک جستجو ہر موج کی تھی
کہ دریا پر تسلط ہو اسی کا
مگر اس خوش گمانی کی بدولت
عجب زیر و زبر کا ماجرا تھا
اسی عالم میں دریا بہہ رہا تھا........!

"یہ دنیا"

ناکام تمناؤں کو سینے میں دبالو
للہ اُمیدوں کے چراغوں کو بجھالو

کچھ اور بڑھانی ہوں اگر عظمتیں اپنی
ناکردہ گناہوں کا بھی الزام اُٹھالو

آئیں نہ تمھیں راس جو گلشن کی ہوائیں
اس دشت کے ذرّات کو پلکوں پہ سجالو

ہم کو نہ توقع ہے نہ اُمّید نہ حسرت
یہ دنیا تمھاری ہے اِسے تم ہی سنبھالو

"لمحۂ فکر"

لمحہ لمحہ ہے یار صدیوں کا
ایک لمحے پہ بار صدیوں کا
لمحۂ فکر ہے یہی لمحہ
جس پہ ہے انحصار صدیوں کا

"پگڈنڈی"

یہ کل کی ہے بات یہ دنیا
بہت بڑی کہلاتی تھی
چھوٹا سا اِک گاؤں بڑا تھا
اِس کٹیا سے اُس کٹیا تک
جو پگڈنڈی جاتی تھی
اپنی باہوں میں رکھتی تھی
ہرے بھرے کھیتوں کے خوشے
کھلی کھلی ہریالی بھی
بہتے جھرنوں کا پانی تھا
سوندھی مٹی کی خوشبو
چرواہوں کے بنسی کی دھن
موہ لیا کرتی تھی من کو
اونچے اونچے پیڑوں سے چھن کر آتی تھی
ٹھنڈی ٹھنڈی دھوپ کی کرنیں
جن پر ساون کے جھولے
ملہار سنایا کرتے تھے
الھڑ، کنواری ، پریم کی ماری
سکھیاں مٹکی تھام کے
پنگھٹ سے پانی بھر لاتی تھیں
دور کہیں پربت کے ٹیلوں پر
آکاش اُترتا تھا
مدھر ہوا کے جھونکے آکر
دل کو لبھایا کرتے تھے
اس پگڈنڈی پر کیا جانے
کتنی صدیاں بیت گئے......

بڑھتے بڑھتے شہر کے سائے
روند کے کھیتوں کی ہریالی
جھرنے ، پنگھٹ ، پیڑ و پربت
کٹیا سے کٹیا کا رستہ
بھینچ لیا ہے اپنے بس میں
قدرت کے رنگین نظارے
فطرت کی نقاشی کو
جس پگڈنڈی پر جیون تھا
توڑ کے اُسکو باندھ رہا ہے
مصنوعی سڑکوں کا جالا
اونچی عمارت کی زنجیریں
رینگتی پھرتی ہیں دھرتی پر
ناگن جیسی موٹر گاڑی
کچھ صناعی کے مرکز بھی آن کھڑے ہیں
ان سب کے سینے سے دھواں اُٹھتا ہے شر کا
تیز ہوا سے باتیں کرتے اُڑن کھٹولے
ساگر کے سینے پر دیکھی
ہم نے چلتی پھرتی دُنیا
پورب کو چھوتا ہے پچھم
اُتر سے دکھشن کا بندھن
پت جھڑ کے موسم کی مانند
ٹوٹ پڑا ہے اس دنیا پر
مصنوعی بارش کا پانی
جس کی رو میں بہتی دیکھی
ہم نے اپنی پگڈنڈی........!؟

"تشویش و اندیشہ"

مقام آزمائش ہے یہ دنیا
مراحل اور مسائل کا ہے مسکن
زمین و آسمان و ماہ و انجم
جبال و دشت و صحرا، بحر و بر کیا
سبھی تھرا گئے اس امتحاں سے

غم ہستی، گراں بارِ امانت
مگر انسان نے ہنس کر اُٹھا لیا
متاعِ غم کی دھڑکن اپنے دل پر
جسے انجام کی پروا نہیں ہے
اسے تشویش و اندیشہ ہے کیوں کر
اُصولِ زندگی جب تک نہیں ہے
متاعِ زندگی بے فیض ہو گی
اگر تقدیر کا قائل ہے انساں
اگر تدبیر پر مائل ہے انساں
تو پھر تشویش و اندیشہ ہے بے جا........

"پرکار ہستی"

تعین[1] ہی حقیقت کی کڑی ہے
حقیقت ہے
مکاں سے لامکاں تک
ستاروں اور سیاروں کے آگے
یہ دنیا ایک نقطے سے بھی کم ہے
اسی نقطے پہ لیکن منحصر ہے
وقوف سوزن پرکار ہستی
یہیں سے دائرے کھینچے گئے ہیں
یہیں سے فاصلے ناپے گئے ہیں
حدود عالم تحت الثریٰ کے
مقام کرسی عرش علے کے
شعاع شمس اور نور قمر سے
یہیں پر روشنی ڈالی گئی ہے
یہیں ظلمات نے ٹھیکہ لیا ہے
یہیں سے روشنی بانٹی گئی ہے
تعین ہی حقیقت کی کڑی ہے......

"نقش بر آب"

دل ہے اک جھیل کی مانند مگر
اُس کی خاموش دھڑکنوں کی زباں
آسمانوں سے بات کرتی ہے
ہر ستارے کو توڑنے کی ہوس
جھیل پر سنگ بن کے گرتی ہے
آرزوں کو چھیڑ جاتی ہے
آنکھ عقاب سی جھپٹتی ہے
خوان نعمت کے ظاہری پن پر
جستجو ایک اٹھ تا طوفاں
موج اٹھتی ہے اُمنگیں لیکر
بحر ہستی کی موتیوں کیلیے
ہو کے مایوس جب پلٹتی ہے
بس یہ کہتی ہے تند موجوں سے
نقش بر آب ہے دنیا کیا ہے........

"شرابِ ہستی"

نہ چکھے جو شرابِ غم کہاں ہستی میں آتا ہے
جو پیتا ہے مئے اُلفت وہی مستی میں آتا ہے
فرشتوں کا ٹھکانہ لاکھ پاکیزہ سہی لیکن
مزہ انسان کو انسان کی بستی میں آتا ہے

"تنقیدِ حبس"

یہ دنیا ہے یہاں چپ سادھ کے رہنا بھی مشکل ہے
ستم اس سے سوا یہ ہیکہ کچھ کہنا بھی مشکل ہے
ہوا کی سرکشی پر سوچ کے تنقید کیجئے گا
یہ ساکت ہوگئی تو حبس کا سہنا بھی مشکل ہے

"رحلت"

گھر کا سکون دفن کیئے گھر کی گود میں
سونے چلے ہیں پھر اُسی مادر کی گود میں
پانی تو کب کا بن کے بخارات اُڑ گیا
اب ریت ہی پڑی ہے سمندر کی گود میں

"پرسہ"

بعد مرنے کے بھی ظالم جی جلانے آئے ہیں
میرے اپنے تھے کبھی، یہ حق جتانے آئے ہیں
جن کی نظروں میں کھٹکتا تھا میں کانٹے کی طرح
آج وہ بھی پھول مرقد پر چڑھانے آئے ہیں

"مزار"

قید ہستی
چار دن کی بات ہے یا
چار صدیوں کا سفر
بے خبر آغاز سے انجام سے

ایک دل
جس کے سینے پر منوں کا بوجھ ہے
اس کے اوپر نفس ہے بیٹھا ہوا
خواہشوں و آرزوں کا جہاں
اک دھڑکتی داستاں

ایک ذہن
مخزن علم و ہنر
طائر فکر و نظر

ذہن و دل
اپنی قدرت کا عصا تھامے ہوئے
ہوش کے پروان چڑھتے ہی
سفر جاری کیا
باندھ کر رخت سفر
ہر قدم تدبیر کا
جستجو منزل کی لو

آرزو اک مرحلہ
ساتھ ہے تقدیر بھی
پاؤں کی زنجیر بھی
کھو گئے کس دھند میں
آج پھر یہ ذہن و دل
پربت و دریا ، سمندر ، ریگزار
چلتا پھرتا اک مزار
تھک گیا اس بوجھ سے
تو لحد میں پائی اماں
پھر منوں مٹی کا بوجھ
ایک مٹی کا مزار !

"برزخ"

یہ کیسی نیند آئی ہے شبِ تر
نہ تکیہ ہے نہ بستر ہے نہ چادر
ملا کر خاک میں نازک بدن کو
رکھا احباب نے اُس پر گلِ تر
ہے کتنی مختلف شام غریباں
نہ شمع ہے نہ کوئی شمع پرور
فقط ناسوت کی مٹی ہی مٹی
پڑی ہے عالم برزخ کے اندر
نہ رشتہ ہے نہ ناطہ ہے نہ بندھن
نہ بندہ ہے نہ آقا ہے یہاں پر
فقط اعمال نامہ ساتھ میں ہے
کوئی مسرور ہے اور کوئی مضطر
یہ رنگ و نور کی دنیا ہے جھوٹی
ہے بے رنگی کا عالم سب سے بہتر
مصوّر ہے نہ ہے تصویر کوئی
قلم باقی رہا نہ لوح و منظر
نہ جانے کتنی مدّت کیلئے ہیں
یہ تختی نام کی یہ خاک و پتھر
فقط اللہ ہی اللہ ہے عزیزؔ اب
مقامِ ھو ہے یہ اللہ اکبر

"انتشارِ ذات"

ذات اپنی
ایسا لگتا ہے
بکھر کر ہو گئی ہے منتشر
تنکا تنکا چن رہی ہے اب
سمٹنے کیلئے
پر ہوا ہے کار فرما
وقت کے شانہ بہ شانہ
ذرے ذرے کو بکھرنے کیلئے
کب تلک جاری رہے گا
کیا خبر یہ سلسلہ
انتشار ذات کا......!

"گہر"

آدمی جو اشرف المخلوق ہے
یونہی بے معنی ملا کب یہ خطاب
جی رہا ہے بلبلا یہ
تند موجوں پر
ہواؤں کے مقابل
بازوئے گرداب میں
ایک چنگاری سی ہے
اس آب میں

ہر کنارے سے کنارے تک
اسی کا راج ہے
آپ خود ظالم بھی ہے
جاہل بھی ہے، نادان بھی
بلبلا خود، موج خود
گرداب خود

ایک قطرہ، اپنی قسمت
اپنی کوشش سے جو بنتا ہے گہر
آپ اپنی ذات میں ہے یہ سمندر
گو بظاہر ایک قطرہ ہی سہی......!

"چراغِ زندگی"

یوں بھی یہ دنیا بڑی عیّار ہے
آدمِ خاکی کی فطرت ہے عیاں
اس عمارت کا یہی معمار ہے
آدمِ خاکی کی قدرت ہے عیاں
سُنّتِ ہابیل اور قابیل سے
آدمِ خاکی کی نیت ہے عیاں
منتظم بھی ہے یہی تنظیم کا
اک نمونہ ہے یہی تعظیم کا
اس جہاں میں ہے اسی سے انتشار
ہے اسی کے دم سے ہی یہ لالہ زار
خوف سے اِسکے جہاں سہما ہُوا
آدمی سے آدمی بہکا ہوا
ہے اسی سے ہر توقع ہر اُمّید
راہزن بھی خود ہے اور خود ہی رشید
اپنے رب کا ماننے والا ہے یہ
علم حق کا جاننے والا ہے یہ
یہ جہاں کیا ہے سُراغ زندگی
آدمی کیا ہے چراغِ زندگی

"ذہن"

جسم و جاں کا ہے مُرکّب
آدمی
جِسم کی پاکیزگی
ایمان ہے
ذہن کو دیتی ہے یہ
اک تازگی
ذہن سے تعمیر ہستی
ذہن سے طرزِ حیات
ذہن سے ہیں سب صفات
ذہن کے دُشمن نگاہ و دل، جگر
نفس کے پیغام بر
خواہشوں کی اس دہکتی آگ میں
ہے ہوا جذبات کی
آفات کی، صدمات کی
جو ہنسائے ایک بار
پھر رُلائے زار زار
روح کی پاکیزگی کے واسطے
ہے ضروری دولتِ علم و عمل
لازمی ہے ایک دستورِ حیات
ذہن پر ہے جسم و جاں کا اِنحصار
ذہن کی پرواز پر دار و مدار......

"خواب اور تعبیر"

جسے سب خواب کہتے ہیں
وہ بیداری کا عالم ہے
جسے کہتے ہیں بیداری
وہی تو خواب ہے یارو
یقیناً خواب جب ہوگا
کوئی تعبیر بھی ہوگی

اگر شفاف ہو شیشہ
نظر آتی ہے ہر صورت
مگر ہو گرد شیشے پر
دکھائی کچھ نہیں دیتا
یہ سب شیشے پہ ہے موقوف

سنو اک خواب وہ بھی ہے
نظر آتا ہے جو دن میں
حواس و ہوش میں یعنی
کسی بھی خواب کا "سچا عمل" تعبیر ہوتا ہے
وہی تخریب ہوتا ہے
وہی تعمیر ہوتا ہے......

"تقدیر و تدبیر"

پوچھتے کیا ہو کہ ہے تقدیر کیا
تدبیر کیا
ہیئت ہستی جو ہے تقدیر ہے
زائچہ ہے زیست کا
ایک خاکہ ہے کسی تصویر کا
اور ہر تصویر تخلیق مصوّر ہی تو ہے
درس کی خاطر مدرّس کی یہی تحریر ہے
اور یہ تدبیر کیا ہے
بس اُسی تحریر پر مشقِ قلم

لکھتے لکھتے روز اِس تحریر کو
سنتے سنتے روز ہر تقریر کو
عود کر آتی ہے اِس میں خود ہی
لکھنے اور پڑھنے کی اُمنگ
رفتہ رفتہ خود ہی لکھتا ہے وہ پڑھتا ہے یہ خود
نئی اپنی داستاں
اپنے ہی الفاظ میں
اُسکا لہجہ فن ہے ہر اظہار کا ، اقرار کا
انکار کا

پھر یہ طالب اپنی ہستی کے سبھی ا۔ کا
علم حاصل کر کے بنتا ہے مدرّس
بس یہی اِک سلسلہ ہی
راز ہے تقدیر و تدبیر کا.......

"وہم و یقیں"

وہم ہے اِک مَن گھڑت
ہیئت کا نام
اِک شِکستہ ذہن کی برگشتگی
اِک خیالی زائچہ
وسوسہ ساکت کیے جاتا ہے
پُتلی آنکھ کی
ذہن پھر اپنے خیالی وصف سے
شکل دیتا ہے نئے اصنام کو
دِل کو دیتا ہے تسلّی عارضی

اور یقیں ہے ایک عطیہ علم کا
پھر یقینِ علم اُکساتا ہے شئے کی دید کو
جذبہ تصدیق یا تردید کو
پھر وہی منظر گذر کر آنکھ سے
دل کو دیتا ہے یقینِ مُحکمی
ثبت کرتے ہیں پھر اپنی مُہر جس پہ
چشم و دل ، ذہن و ضمیر

اک یقینِ عشق بھی ہے
مظہر مہر و وفا
مشہدِ صدق و صفا
جو کسی تصدیق کا حامی نہیں
تُحفہء توفیق ہے
عطیہء ربِ جلیل
فضل رب کا اک ثبوت
ایک لمحہ اُس جنوں کا
زیر کر دیتا ہے ہر احساس کو
پھر شعورِ دل یہ کہتا ہے
بصد عجز و نیاز
ہاں میں شاہد ہوں
اُسی مشہود کا
جو بعید از فہم ہے
نزدِیک جاں......!

"قیامت"

بنائے کائنات و نظم ہستی
دلیل حکمت و قدرت خدا کی
ازل سے تا ابد نقش معظم
مکاں تشکیل پایا لا مکاں سے
پس تعمیر ہے انجام و مقصد
نتیجہ آخرت ہے اس کڑی کا

دلیل اولیں یہ خوبصورت
زمین و آسماں
شمس و قمر ہیں
وجودِ انجم و سیارگاں ہی
مکانِ زیست کی بنیاد ٹھہرے
ازل سے ایں زماں، روزِ ابد تک
منظّم ہیں، رہیں گے چاند تارے

دلیل ثانوی تخلیق آدم
مکمل پیکر عشق و محبت
اساس حاصل دنیا و دیں ہے
اسی کی ذات سے منسوب ہیں یہ
جمیع مخلوق و موجودات ہستی
اسی کے واسطے پیدا کیے ہیں
خدائے پاک نے جن و ملائک
اسی کے دم قدم سے زندگی ہے
اسی کے ولولوں سے بزم دنیا

"مقیاس"

جس طرح روزِ ازل سے
وقت کا جن گامزن ہے
سوئے منزل دم بہ دم
ہے کسی مِقیاس کی مانند
جس کا ہر قدم
فرق ہوتا ہی نہیں رفتار میں
جذبہ ایثار میں
اس کے ہر اقرار میں
وقت دیتا ہے پیامِ زندگی
اِک اُصول و ضابطہ دستور کا
اِک نمونہ، اِک مثال
اِک نظامِ زندگی

قلبِ انساں بھی تو اِک مقیاس[1] ہے
اپنی فطرت، اپنی قدرت
اپنی نیت کا امیں
تولتا ہے ہر عمل کو یہ ضمیر
گامزن ہے سوئے منزل
پھونک کر ہر اِک قدم
دشت و صحرا میں چمن میں

موسموں کے ناز اُٹھاتے
بوجھ سینے پر اُٹھائے
حادثوں کو اپنی پلکوں پر سجائے
گرم ریتیلی زمیں پر
یا کبھی قالین سی ہریالیوں میں
یہ نشیبی یا فرازی
رہ گذر
آزماتی ہے اُسے ہر اک گھڑی
اُسکو اکساتی ہے پھر سیئات پر
کھینچ لاتی ہے رہِ حسنات سے
وہ گھڑی ہر مردِ مومن کیلئے
صُورِ اسرافیل سے کچھ کم نہیں
اور وہی مِقیاس ہے.......

۱۔ مقیاس = ضمیر

یہی وہ نور ہے نوری ہیں جن سے
یہی وہ نار ہے ناری ہے جن سے
لزوم نظم ہستی ہے اسی پر
بلندی اور پستی ہے اسی سے
اسی کے واسطے سب نعمتیں ہیں
اسی کے واسطے سب منزلیں ہیں
اسی کے واسطے ہر رہبری ہے
اسی کے واسطے ہر گمرہی ہے
یہی ایمان کامل کا نمونہ
یہی مشکور خوان بے بہا ہے
یہی ہے مجرم کفرانِ نعمت
اسی پر ہے خدا کی ساری رحمت
اسی پر ہے مدار ظلم و زحمت
اسی خاکی میں پنہاں ہے حقیقت
اسی کے دوش پر بارِ امانت
یہی تو حامل تقدیر بھی ہے
یہی تو قادر تدبیر بھی ہے
اسی کے سامنے ہیں خیر و شر بھی
اسی کے سامنے راہِ عمل بھی
عمل ہی پر اساس زندگی ہے
عمل ہی سے ظہورِ بندگی ہے

قیامت ہے دلیل حرف آخر
حساب زندگی کا آخری دن
حیات جاوداں کا روز اول
وہی دن حاصل آغاز ہو گا
وہی دن مظہر انجام ہو گا........

ایک پیام۔۔۔مِلّت کے نام

" زمیں سخت ہے آسماں دور ہے "

گیا وقت جب ہم تھے میرِ سفر
مگر آج کیوں ہیں اَسیرِ سفر
تھی صدیوں تلک اپنی جادوگری
تھی دنیا میں مشہور زِندہ دلی
دِلوں میں حرارت تھی ایمان کی
نگاہوں میں تیزی تھی ایقان کی
مزاحم تو پربت بھی، دریا بھی تھے
مگر ہم کبھی اِک چھلاوہ بھی تھے
تھے یارانِ شمشیر و تیغ وسناں
بدکتے تھے ہم سے زمیں آسماں
جو دل میں تھا وہ کر گذرتے تھے ہم
شجاعت سے جیتے تھے مرتے تھے ہم
تھے ضیغم بھی سہمے ہوئے کل تلک
تھی اپنے ہی نقشِ قدم کی جھلک
مگر آج نقشہ ہے بدلا ہوا
یہ شفاف پانی جو گدلا ہوا
دلوں سے وہ مِلّت کا غم مٹ گیا
محمدؐ کی اُمّت کا غم مٹ گیا
ہمیں میں ہیں کچھ اپنے ہی کف شکن
صفیں خاک باندھیں گے یہ صف شِکن

خود اپنی صفوں سے یہ غافل ہوئے
یزیدوں کے لشکر میں شامل ہوئے
جو بڑھ کر صفیں چیرتے تھے کبھی
خود اپنوں سے کرتے ہیں رسہ کشی
خدا ایک ، رسول ایک ، قرآن ایک
مگر اب کہاں سب مسلمان ایک
گروہوں میں بٹ کر جُدا ہوگئے
جماعتوں میں کٹ کر ہوا ہوگئے
مساجد میں پڑھتے ہیں یوں تو نماز
مگر کیا پتہ ، کیا ہیں راز و نیاز
وہ رہبر ، وہ راہی ، وہ رستہ نہیں
خلوص و وفا دست بستہ نہیں
اعانت سے اکمل سیاست ہوئی
امانت سے افضل خیانت ہوئی
محبّت سے برتر رقابت ہوئی
حقارت سے کم تر لیاقت ہوئی
خدا ہم کو توفیق ایمان دے
دِلوں میں مجاہد کا ایقان دے
بدل دو روش گھر کے افراد کی
دِکھاؤ اُنہیں راہ اجداد کی
یہ موسم سدا گنگناتا نہیں
" گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں "
نشاں اپنی منزل کا کافور ہے
" زمیں سخت ہے آسماں دور ہے "

"فریاد"

اَے خدا کیا چیز لایا تھا وہاں سے کچھ نہیں
اور لے جاؤں گا میں کیا کچھ یہاں سے کچھ نہیں ؟

آب و آتش ، باد اور مٹی کی پیداوار ہوں
اور مرا رشتہ زمین و آسماں سے کچھ نہیں ؟

اپنے سارے غم چھپاتا ہوں خزانے کی طرح
اور ملے گا کیا مجھے دردِ نہاں سے کچھ نہیں ؟

تجھ کو اَے مالک غرض ہے اک نتیجے سے میرے
اور مرا مطلب میرے ہی امتحاں سے کچھ نہیں ؟

تو نے کس کے رکھدیا تقدیر کے اِک جال میں
پھر بھی میں نے کچھ کہا اپنی زباں سے کچھ نہیں ؟

دورِ آدم سے ابھی تک آدمی بے چین ہے
کیا ہوا اس آئینِ امن و اماں سے کچھ نہیں ؟

قتل و خوں کے نت نئے فتنے اُجاگر ہوگئے
کیا ہوا مظلوم کی آہ و فغاں سے کچھ نہیں ؟

روئی کی مانند ہے انسانیت دُھنکی ہوئی
ریزہ ریزہ آئینہ ہے ، کانچ ہے بکھری ہوئی
اک اذیت بن چکی ہے ، آدمی کی زندگی
ہر توقع اُٹھ چکی ہے آس ہے ٹوٹی ہوئی

خَیر سے بھاری ہوا جاتا ہے شر کا زور کیوں
یہ زمیں تیری ہے اس پہ صنعتوں کا شور کیوں
آدمیت کا خزانہ لُوٹتا ہے آدمی
اب ضمیر انسان کا ہی بن گیا ہے چور کیوں

دَور آیا پھر وہی فرعون کا ، نمرود کا
پھر وہی نقشہ نظر آتا ہے ہست و بود کا
آدمی کو خوف سا ہے آدمی کے نام سے
اِس جہاں میں پھر سے سِکّہ جم گیا مردود کا

امت خیر الوری کو شر سے تو محفوظ رکھ
سنتِ نور الہدیٰ کی روشنی ہو ہر طرف
گونج اُٹھے پھر سے صوتِ حق فضاء میں چار سو
مدحت حق کی ہی لب پر چاشنی ہو ہر طرف
(آمین)

"شکوہ"

کارزارِ زیست ہے
چاند، سورج
رات اور دن
رنج و راحت کے سبب
ہے رضامندی قلندر کی صفت
اور شکوہ فطرتِ آدم ہے بس........

قطعات

لکیریں بول اُٹھتی ہیں جو چُپ رہتی ہیں تصویریں
حقیقت جاگ اُٹھتی ہے جو بج اُٹھتی ہیں زنجیریں
حِقارت سے فلک نہ کہہ ہمیں تو خاک کا پُتلا
بِگڑ جاتا ہے جب انسان سہم جاتی ہیں تقدیریں

اَےَ تلاطم اب ٹھہر جا ہوش میں آنے بھی دے
مانتے ہیں اَےَ ستمگر یہ ستم جانے بھی دے
تجھ سے ہم ٹکرا چکے ، تنگ آچکے ، باز آچکے
اب سفینے کو مرے ساحل سے ٹکرانے بھی دے

ہم راہ بن کے دشتِ وفا میں ٹھہر گئے
تم ایک راہرو تھے نہ جانے کدھر گئے
اپنی حدوں سے ہم کو گذرنا نہ آسکا
ہم پر سے حادثات ہزاروں گذر گئے

خوبصورت زندگی کی داستاں سُنتے رہے
زندگی بھر زندگی کے خواب ہی بُنتے رہے
اپنا دامن عمر بھر کانٹوں میں ہی الجھا رہا
اُنکا دامن بھر گیا جو پھول ہی چُنتے رہی

داغ کچھ غم سے لگے، کچھ شادمانی سے لگے
کیا دلِ آزردہ خاطر زِندگانی سے لگے
اشک ہی وجہِ الم ہے، اشک ہی وجہِ خوشی
آگ پانی سے بُجھے ہے آگ پانی سے لگے

لغزش یہ کیسی آدمِ نادان کر گیا
شیطان زِندہ رہ گیا، اِنسان مر گیا
شیشے کو توڑنے کی تو سازش تھی اور کی
الزام جب گیا تو وہ پتھّر کے سَر گیا

اپنی شکستِ فاش سے یہ فائدہ ہوا
ایسا لگا ہے مجھ کو کہ میں مَر کے جی اُٹھا
ہوتی ہے رات ہی سے تو تشکیلِ صُبحِ نَو
نُورِ شفق سے ڈُوبتے سورج نے یہ کہا

یہ تحائف لیکے آئی ہے ہماری زندگی
کڑوی سچّائی کا غم، جُھوٹی تسلّی کی خوشی
چُپ رہیں تو خود فراموشی، کہیں تو خود سری
دیدنی ہے دیدنی ہے آدمی کی بے بسی

یہ بھی سچ ہے کہ شب تھی سویرا نہ تھا
پھر بھی گھر کا اندھیرا اندھیرا نہ تھا
گھر جو چھوٹا تو خیمے میں آیا خیال
اپنا گھر بار تھا کوئی ڈیرہ نہ تھا

خوشی گم ہوگئی اپنی تو سارے غم بھی کھوجائیں
اب ایسی نیند آئے خواب کے عالم بھی کھوجائیں
تمناؤں کا سورج ڈھل چکا ، منزل کی دھن ٹوٹی
چلو اس رات کی تاریکیوں میں ہم بھی کھوجائیں

ہوئے ہیں عشق میں ہم کس قدر حیران مت پوچھو
زیاں و سود کا ہم سے کوئی میزان مت پوچھو
یہ کیا کم ہے مقامِ دار تک پہنچادیئے ہم کو
کرم اتنا کرو اب آخری ارمان مت پوچھو

ملی ہے عمر ساری کام کے دو پل نہیں ملتے
معمّے تو ہمیں ملتے ہیں اُنکے حل نہیں ملتے
گلا پودوں کا واجب اور ہمارا بھی گِلا واجب
اُنہیں پانی نہیں ملتا ہے ہم کو پھل نہیں ملتے

نظامِ دُنیا جو مُنتشر ہے نہ جانے کِس دِن بحال ہو گا
جواب کیا دیں، ہر ایک لَب پر اگر یہی اِک سوال ہو گا
جہاں چہکنا بھی نارواہو، جہاں سِسکنا بھی اِک خطا ہو
اُس انجمن کی روایتوں سے نِباہ کرنا مُحال ہو گا

رَہبر ہمارے حُکم چلانے میں رہ گئے
دستور سارے میز کے خانے میں رہ گئے
مِعمار کو تعمیر کا اِعزاز مِل گیا
مزدور اَپنا بوجھ اُٹھانے میں رہ گئے

خَوف و دَہشت کی وَزیروں نے مُنادی پھیر دی
زِندگی کے اُجلے چہرے پر سِیاہی پھیر دی
ریت پر کیا کیا نہ لِکھا تھا اُمنگوں سے عزیزؔ
آج اُس تحریر پر ہم نے ہتھیلی پھیر دی

پتھر صِفت ہیں لوگ کوئی موم سا نہیں
اِس پر سِتم یہ ہے کہ تعجب ذرا نہیں
یہ بھی ہے ایک حِکمتِ حاضر کا کرشمہ
گِرتا ہے آئینہ بھی مگر ٹُوٹتا نہیں

جس طرح دل ہے ضروری دِلنشیں کے واسطے
اِک مکاں بھی لازمی ہے ہر مکیں کے واسطے
عمر ساری دیکھے میں اِک گھر بنایا تھا مگر
اقرباء حیراں ہیں پھر دو گز زمیں کے واسطے

آدم سے نسلِ آدم اِک دَم سے سینکڑوں دم
صد رنگ ، صد نسب میں کس طَرح بٹ گئے ہیں
لگتا ہے یہ زمیں خود محوَر سے ہٹ گئی ہے
یا ہم ہی آپ اپنے منظر سے ہٹ گئے ہیں

آدمی عیب و ہنر ہیں مُستند تیرے لئیے
سارے دَستاویز تیرے ، ہر سَند تیرے لئیے
ہیں قصیدے ہی قصیدے ہو اگر تو نیک خو
ورنہ یہ حرفِ ملامت ، لفظِ بد تیرے لئیے

تلخی چھپی تھی زیرِ تبسّم ، نہیں جانے
کس کی طرف تھا روئے سخن تم نہیں جانے
تم شعر سُن رہے تھے بڑے اِنہماک سے
لیکن مِرا اندازِ تکلّم نہیں جانے

اِک مَرحلہ ہے تلخ تکلّم سے نِمٹنا
مُشکل ہے بہت میرے لئیے تمؔ سے نِمٹنا
قِسمت سے مِلی ہے ہمیں کاغذ کی یہ کشتی
اور اُس پہ ضروری ہے تَلاطُم سے نِمٹنا

خُو بدل دیتی ہے یارو آپ ہی مجبوریاں
موم کو پتھر بنادیتی ہے رَو جذبات کی
میکشی ہوتی نہیں ہے لا اُبالی کا سبب
ناصحا ! یہ دین ہے بس تلخئ حالات کی

زندگی بھر عشق کے اَسباق میں مارے گئے
چھپ کے بیٹھے طاق میں تو طاق میں مارے گئے
وہ تو دَانا تھے سِیاسی مَوت نے مارا جنہیں
ہم وہ دِیوانے ہیں جو اَخلاق میں مارے گئے

سہارا بے کسوں کو مال و زر والا نہیں دیتا
یہ کیسا پیڑ ہے جو دھوپ میں سَایہ نہیں دیتا
غلط ہے یہ تمھارا پُوچھتے پھرنا زمانے سے
پتہ اَپنا کسی کو کوئی بنجارہ نہیں دیتا

بِن پیئے ہی سر جو چڑھ جاتی ہے اُس مستی میں ہوں
جس میں صہبا ہی نہیں ہے بس وہ پیمانہ ہوں میں
میں خِرد مندوں کی کج فہمی پہ حیرانی میں ہوں
اور دُنیا یہ سمجھتی ہے کہ دِیوانہ ہوں میں

تم نے رکھ دی سامنے اپنی کِتابِ زندگی
کیا کہوں کہ اِک حقیقت ہے یہ ساری داستاں
جو پڑھے گا وہ یہی کہتا ہوا رہ جائیگا
پڑھ رہا ہوں آپ بیتی یا تمھاری داستاں

عمر کافی ہے ادب کی تجربہ ہے مختصر
اَے قد آور آشنا سن قد مِرا ہے مختصر
دل کے آگے حسرتوں کی ہے بڑی لمبی قطار
وقت لیکن زندگی کا رہ گیا ہے مختصر

چبھتے ہیں ہر نظر میں سر پھر بھی خم نہیں ہے
کانٹوں کا بانکپن بھی پھولوں سے کم نہیں ہے
شیشہ صفت ہیں لیکن پتھر بنے ہوئے ہیں
یوں جی رہے ہیں جیسے اِحساسِ غم نہیں ہے

خبر جو اِک نئے طوفان کی آئی تو یاد آیا
سَفینہ تو ہے طوفاں میں کِنارا جب سے چھوڑا ہے
نہ رکھتا ہے تعلق اور نہ مجھ سے بے تعلق ہے
کسی نے ساتھ بھی چھوڑا ہے تو کِس ڈھب سے چھوڑا ہے

کس قدر لمبا سفر ہے زندگی کا یہ سفر
شام سر پر آگئی ہے پھر بھی گھر آتا نہیں
انتظارِ یار میں لو نیند تو جاتی رہی
رات کیوں جاتی نہیں ہے وہ اگر آتا نہیں؟

سایۂ گُل میں کبھی گھر جو بنانا چاہا ۔۔۔ بجلیوں نے بھی وہیں اپنا ٹھکانا چاہا
سی رہا ہوں اُسی خوش بخت کی صد چاک قبا ۔۔۔ جو پرخچے مرے دامن کے اُڑانا چاہا
دل کو رہتا ہے اِسی بات کا افسوس عزیزؔ ۔۔۔ تم نہیں چاہ سکے جس کو زمانہ چاہا

آئینہ دیکھ کے جلوؤں کو نہ حیراں کرنا ۔۔۔ نا مُناسب ہے یوں اندھوں کو پریشاں کرنا!
گُل کو پامالیٔ حالات کے تابع کر کے ۔۔۔ باغبانی پہ یوں آندھی کو نگہباں کرنا!
شمع جلتے ہی یہ پروانہ بھی جل اُٹھتا ہے ۔۔۔ کیا ضروری تھا شبستاں میں چراغاں کرنا؟
ظلمتِ شب کا سِتاروں سے تعلق ہے مگر ۔۔۔ صبح دم رات کے سایوں کو نہ عُریاں کرنا
میری ذِلت ہے تو خود تیری بھی رُسوائی ہے ۔۔۔ تو پشیماں ہے تو مجھ کو بھی پشیماں کرنا
میری فِطرت میں ہے پیوند لگاتے جانا ۔۔۔ تیری عادت ہے اگر چاک گریباں کرنا
کیسی فِطرت ہے یہ خاکی میں وَدیعت یارب ۔۔۔ دشت کو باغ تو گلشن کو بیاباں کرنا
آپ خود اپنی روش پر بھی نظر رکھ اے عزیزؔ
غیر موزوں ہے یوں سائے کو ہِراساں کرنا